خواتین کا علمی ادبی اصلاحی جریدہ

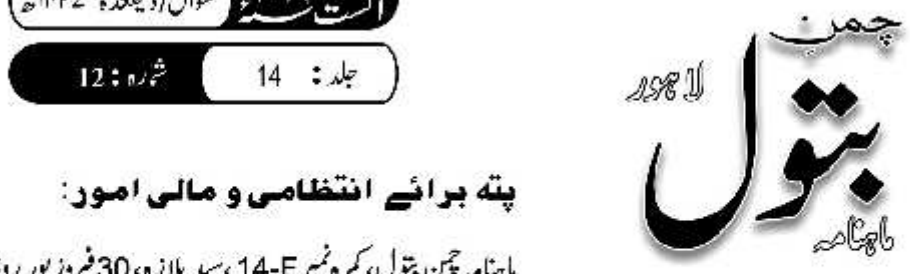

ماہنامہ چمن بتول لاہور

اگست ۲۰۱۶ء | شوال/ذیقعدہ ۱۴۳۷ھ

جلد : 14 | شمارہ : 12

مجلس ادارت

نگران — ثریا اسماء

مدیرہ — صائمہ اسماء

نائب مدیرہ — آسیہ راشد

پتہ برائے انتظامی و مالی امور:

ماہنامہ چمن بتول، کمرہ نمبر F-14 ، سید پلازہ، 30 فیروز پور روڈ،

لاہور۔ 54600 فون: 0321-5933338-042-37424409

chamanebatool7585@gmail.com

پتہ برائے ادارتی امور:

28۔اے الفا سوسائٹی کینال روڈ، پوسٹ آفس نیو کیمپس

لاہور۔54590فون:35293624-35293604

ای میل:idarabatool@yahoo.com

ویب سائٹ: www.batool.com.pk

قیمت 40روپے

سالانہ 400روپے

امریکہ، کینیڈا	2800 روپے
یورپ، مشرقِ وسطیٰ	2000 روپے
بنگلہ دیش، ایران، بھارت	1900 روپے

کراچی بیورو:

c/o بلال ایسوسی ایٹس۔ مختار گوہر E-261 ای مارکیٹ

بلاک 6 پی ای سی ایچ ایس کراچی

فون: 021-35313695/6

فیکس: 021-35313697 مختار گوہر۔0321-8750587

ای میل : syedmgh2013@gmail.com

نوٹ: خط و کتابت اور بدل اشتراک ارسال کرتے ہوئے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

ڈاکٹر امتیاز علی پبلشرز نے میٹرو پرنٹرز سے چھپوا کر دفتر ادارہ بتول F-14 سید پلازہ، 30 فیروز پور روڈ، لاہور سے شائع کیا۔

فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوارِ ربانی	اسلام امن اور خوشحالی کا دین	آمنہ منظور	8
قولِ نبیؐ	کرپشن بربادی کا راستہ	عائشہ ایاز	11
خاص مضمون	آج کا نوجوان	میر بابر مشتاق	13
	پہلا وہ گھر خدا کا	ستارہ منصور	18
نوائے شوق	نعت	نجمہ یاسمین یوسف	22
	قرب قرآن ہو عطا مولا	روبینہ فرید	22
	غزل	حبیب الرحمن	23
حقیقت و افسانہ	یہ ساٹھ سال	صبیحہ نبوت	24
	بازگشت	قانتہ رابعہ	26
	خوابِ غربت	نادیہ سیف	28
	چوڑیاں اور کنگن	آسیہ عمران	31
	ویران گھروندا	شمیم لودھی	34
طویل کہانی	میری کہانی میرزبانی	حبیب الرحمان	36
سیر و سیاحت	تمہارے شہر کا موسم	فرحت طاہر	46
یادداشتیں	سلسلہ روز و شب	شیما ہمایوں	51
ہلکا پھلکا	بات ہے اقدار کی	افشاں نوید	58
نہاں خانۂ دل	رمضان کے بعد	روبینہ فرید	60
علم و ادب	حالی اور تہذیب الاخلاق	پروفیسر صغیر افراہیم	62
پل صراط پر	سسرال کو اپنا بنائیں	حمیرہ خالد	66
	عورت، غیرت کا سرکس اور نفس کا کنواں	نوری الہدیٰ	68
محشر خیال	قانتہ رابعہ، حبیب الرحمن، فرحت طاہر، صبیحہ نبوت، فاطمہ گیلانی، سحر شہزاد		72
گوشۂ تسنیم	اپنی عدالت میں	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	78

ابتدا تیرے نام سے

محترم قارئین! بائیس سالہ برہان وانی کی شہادت نے کشمیریوں کی جدوجہدِ آزادی میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ گزشتہ لگ بھگ ستر سال سے جاری کشمیریوں کی یہ جدوجہد گواہ ہے کہ انہوں نے وادی پر بھارت کا ظالمانہ تسلط ایک دن کے لیے بھی قبول نہیں کیا۔ وہ خود کو ہر لحاظ سے پاکستان کا حصہ سمجھتے ہیں اور اپنے اس حق سے دستبردار ہونے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں ہیں۔ اس کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ برہان وانی شہید کی نماز جنازہ میں لاکھوں افراد نے شرکت کی جن میں اس کے مجاہدین ساتھی بھی شامل تھے اور ان کو روکنے کی جرأت بھارت کی سات لاکھ کی فوج بھی نہ کر سکی۔ جبکہ کشمیریوں کے غدار فاروق عبداللہ کی قبر کی حفاظت پر بھی ان کو مسلح محافظ کھڑے کرنے پڑتے ہیں۔ مجاہدوں کا ساتھ دینے کی سزا کشمیری عوام کو پیلٹ گنوں کے فائروں کی صورت میں بھگتنی پڑی۔ اب تک ساٹھ سے زیادہ کشمیری شہید ہو چکے ہیں جبکہ بے شمار نہتے شہری پیلٹ گن فائر سے بینائی کھو چکے ہیں۔

کشمیر کی جدوجہدِ آزادی کے بارے میں دنیا کے سامنے موثر انداز میں حقائق پیش نہ کرنا ہماری کھلی سفارتی ناکامی ہے۔ کشمیری پاکستان کے ساتھ الحاق کی خاطر جانیں دے رہے ہیں اور ہم سفارتی سطح پر ان کی قربانیوں کو اجاگر کرنے میں بھی ناکام ہیں یہاں تک کہ اسلامی ممالک کو بھی اپنا مکمل ہمنوا نہیں بنا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت اس حد تک آ گیا کہ برہان وانی کو دہشت گرد کہہ کر اپنے ظلم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ بہترین وقت ہے کہ پاکستان دنیا کو بتائے کہ کشمیری اپنے جائز حق خودارادیت کے لیے نصف صدی سے جانیں دے رہے ہیں اور ان کی یہ تحریک خالصتاً مقامی تحریک ہے۔ پاکستان اگرچہ اس خطے پر اپنا جائز دعویٰ رکھتا ہے، مگر کشمیریوں کی مسلح جدوجہد کو خود کشمیری مسلمان جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اپنے اسی جائز دعویٰ کی بنیاد پر پاکستان کی جانب سے کشمیریوں کے قتلِ عام پر بھارت کو تنبیہہ جاری کی جا سکتی تھی۔ اللہ ہمیں ایسی جرأت مند قیادت دے جو قومی سلامتی کے ان معاملات پر مضبوط موقف اپنا سکے۔ امین۔

قندیل بلوچ کا قتل ایک افسوسناک واقعہ ہے۔ اس کی پہلی ایف آئی آر پرائیویٹ میڈیا چینلز کے خلاف کٹنی چاہیئے جنہوں نے اس کی سستی شہرت کی طلب کا فائدہ اٹھایا اور اپنی ریٹنگ بڑھاتے رہے۔ پھر ایک عالم دین کو بدنام اور بلیک میل کرنے کے لیے اسے انتہائی گھٹیا طریقے سے استعمال کیا۔ جس بیہودہ اور لچر انداز میں ٹاک شوز اس معاملے کا مزا لیتے رہے، اس کی اجازت میڈیا یا اخلاقیات تو کیا، کسی بھی سطح کی اخلاقیات نہیں دے سکتی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کیسی عورت ہے، اس کے بیانات کو اہمیت دی گئی اور ایک دیندار آدمی کی عزت اچھالی گئی۔ اور وہ بھی ایک ایسا شخص جس کے معتقدین بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ جب سے ہم دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کا حصہ بنے ہیں، پاکستان میں دین اور علمائے دین کا منفی تاثر پھیلانے کا ایجنڈا میڈیا کو دے دیا گیا ہے جس میں اب روز بروز تیزی آتی جا رہی ہے۔ میڈیا نے اپنے نیچ مقاصد کی خاطر ایک غریب اور گمراہ عورت کو اس طرح استعمال کیا کہ اس کے لیے واپسی کے سارے راستے بند کر دیے، معاشرے نے اس کو قبول کرنے سے انکار دیا اور وہ مبینہ طور پر اپنوں ہی کے ہاتھوں المناک انجام کا شکار ہو گئی۔

اس واقعے نے پاکستان میں پرائیویٹ میڈیا کے کردار اور پیمرا کے اصول وقواعد پر سنگین سوالات اٹھائے ہیں۔ جس چینل نے جعلی آواز میں مفتی عبدالقوی کا بیان سنوایا اس کا لائسنس فوری اور مستقل طور پر منسوخ ہونا چاہیئے تھا۔ ایک کال گرل کی بیہودہ الزام تراشی اور نامناسب لباس پر مبنی فوٹیج چلانے پر متعلقہ چینلز کو جرمانہ ہونا چاہیئے تھا۔ اس بات کا بھی فیصلہ ہونا چاہیئے کہ کس سطح کی خبر کو کتنی بار چلنا چاہیئے۔ اس میں خبریت کا معیار کتنا ہے؟ قومی منظرنامے میں اس کا مقام اور اہمیت کیا ہے؟ بریکنگ نیوز کی تعریف پر کون سی خبریں پوری اترتی ہیں؟ ٹاک شوز کی اخلاقیات کیا ہونی چاہئیں؟ کیا ہر معاشرتی، حساس، نازک اور سنگین نوعیت کے معاملے کو ریٹنگ بڑھانے کے لیے سنسنی خیز بنایا جا سکتا ہے؟ ہر عورت کو مرچ مسالہ بنا کر پیش کرنے سے اس عورت کی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ کسی معاملے کو نمایاں کرنے سے معاشرہ کتنا تقسیم ہوگا؟ نفرتیں کتنی بڑھیں گی؟ بیرونِ ملک کیا تاثر بنے گا اور اس تاثر کی اصل حقائق کے ساتھ کتنی مناسبت ہوگی؟ لوگوں کا ہر چھوٹی بڑی بات کو ''جاننے کا حق'' زیادہ اہم ہے یا ذاتی زندگیوں کا سکون اور پرائیویسی۔۔۔ معاشرے کی یک جہتی اور ہمواری؟

مقاصد سے ہم آہنگ ہونے کی ضرورت ہے تا کہ پرائیویٹ میڈیا ہمارے ماحول اور معاشرے کے مطابق اپنا مثبت کردار ادا کرے۔

باقی رہا غیرت کے نام پر قتل کا معاملہ، تو اس سلسلے میں قانون سازی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر چونکہ ہمارے ہاں ایسے جرائم کے پیچھے اکثر بااثر افراد ہوتے ہیں، اس لیے قانون کا ہونا نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے۔ قندیل بلوچ جیسی عورتیں ان کی ضرورت ہوتی ہیں اس لیے ان کو پروموٹ کیا جاتا ہے اور جب چاہا راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ یا پھر انہی کے سگے اپنی بے عزتی برداشت نہ کر سکنے پر ان کو مار دیتے ہیں۔ ایسی عورتوں کا یہ انجام ہر معاشرے کا حصہ ہے۔ مغرب میں اپنے عاشقوں کے ہاتھوں ماری جاتی ہیں یا سگے رشتے قاتل بن جاتے ہیں۔ حالانکہ وہاں قانون بھی ہے اور قانون کی عملداری بھی۔ اس کا واحد حل قانون کے ساتھ ساتھ معاشرے کی اخلاقی تربیت ہے۔

ترکی میں منتخب حکومت کے خلاف فوجی بغاوت اس ماہ کے بے حد اہم واقعات میں سے تھی۔ اس سے پہلے مصر میں ایک عوامی اور منتخب حکومت کے ساتھ امریکہ اور بعض اسلامی ممالک کے ایما پر جو کچھ ہو چکا ہے، اس کے تناظر میں اس خبر نے بے حد اضطراب پیدا کیا۔ مگر وہاں کے عوام نے اس سازش کو جس بہادری سے ناکام بنایا، وہ ترکی کی تاریخ کا ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ امریکی سرپرستی میں کام کرنے والے صوفی اسلام کے علمبردار فتح اللہ گولن کا ہاتھ اس بغاوت میں ثابت ہونا ایک افسوسناک امر ہے۔ اس سے ایک بار پھر ثابت ہوتا ہے کہ عالمی طاقتوں کو اصل خطرہ سیاسی اسلام کے علمبرداروں سے ہے اور اس کے لیے جمہوریت یا آمریت کی کوئی تخصیص نہیں۔ طیب اردگان نے ترکی میں آمرانہ تسلط کے خلاف برسوں کی جدوجہد میں اتنی کامیابی حاصل کر لی ہے کہ اس بغاوت کو ناکام بنانے میں اپوزیشن کی تمام جماعتوں نے بھی بھرپور ساتھ دیا بلکہ جاں بحق ہونے والوں میں ترکی کی سیکولر جماعت سی ایچ پی کے چودہ کارکنان بھی شامل تھے۔ دوسروں سے مل کر اپنے وطن کے خلاف بغاوت جدید دنیا میں ہر جگہ ایک انتہائی سنگین اور ناقابلِ معافی جرم ہے۔ لیکن امریکہ اور یورپی یونین کے ابتدائی بیانات واضح کر رہے تھے کہ یہ سازش کس کے ایما پر تیار کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ہمارے پرائیویٹ میڈیا کی قلعی بھی کھل گئی جس نے جمہوریت کے خلاف اس سازش کو عوامی انقلاب کا رنگ دینے کی کوشش کی۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے میڈیا میں غالب عنصر کس نوعیت کا ہے اور کس کی خدمت سرانجام دے رہا ہے۔

فرانس میں سڑک پر شوٹنگ کے واقعے میں کئی جانیں چلی گئیں۔ حملہ آور ایرانی نژاد فرانسیسی شہری تھا۔ مغربی ممالک میں بلاوجہ فائرنگ کر کے بے گناہوں کو مار دینا ایک معمول کا واقعہ ہے۔ ایسے بیسیوں واقعات ہر سال رپورٹ ہوتے ہیں۔ مگر مارنے والا اگر مسلمان ہو تو اسے دہشت گردی سے ضرور جوڑا جاتا ہے اور اسلام کو بدنام کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ایم آئی فائیو کی رپورٹ کے مطابق دہشت گردی کے زیادہ تر مجرم اسلامی تعلیمات سے ناآشنا اور بے عمل تھے۔ حالیہ واقعات بھی یہی ثابت کرتے ہیں۔ اور لینڈ وشوٹنگ کا مجرم عمر متین اور فرانس کے شہر نیس میں حملہ آور محمد بوہلو دونوں کی زندگی بے راہروی پر مبنی اور اسلامی تعلیمات سے کوسوں دور تھی۔ البتہ یہ امکان مدنظر رکھنا چاہیئے کہ امریکہ اور اس کے حواریوں کی پالیسیوں اور جنگی اقدامات کے نتیجے میں عالم اسلام جس قدر مصائب کا شکار ہے، اس کے ردعمل میں بے سمجھ جذباتی نوجوان ایسے اقدامات کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔ اگر ان واقعات پر مکمل قابو پانا ہے تو امریکہ کو مسلمانوں کے لیے اپنی نفرت انگیز پالیسیاں اور دہرے معیار بدلنے ہوں گے۔

دنیا بھر میں بے لوث خدمت کی مثال بننے والے عبدالستار ایدھی انتقال کر گئے۔ وہ پاکستان کا بیش بہا سرمایہ تھے۔ پاکستان جہاں کئی سالوں سے موت بانٹنے والوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، وہیں ایدھی جیسے لوگ ہر پل زندگی تقسیم کرتے رہے، محتاجوں کا وسیلہ اور بے سہاروں کا سہارا بنے رہے۔ ان گنت بیماروں کی شفا اور یتیموں کی کفالت کا ذریعہ بنے۔ روزِ حشر نہ جانے کتنے انسانوں کی گواہیاں ان کے جلو میں ہوں گی۔ اللہ ان کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے اور ان کے مشن کو اہلِ پاکستان کی خدمت کے لیے ان کا صدقہ جاریہ بنائے آمین۔

گزشتہ اداریے میں مرحوم محمد علی کلے کا شذرہ سہواً چھوٹ گیا۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے۔ مرحوم دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے جرأتِ ایمانی کا ایک استعارہ تھے خصوصاً امریکہ کے سیاہ فام مسلمانوں کے لیے۔ ان کے مقابلوں کے دوران سارے عالم اسلام کے دل ان کے لیے دھڑکتے تھے۔

اگلے ماہ تک کے لیے اجازت بشرطِ زندگی! طالبہ دعا

آمنہ منظور

اسلام امن اور خوشحالی کا دین

کلمۂ طیبہ پڑھ کر جب ایک شخص دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے تو وہ ایمان کی بیش بہا دولت سے مالا مال ہوجاتا ہے۔ایمان کا لفظ امن سے نکلا ہے یعنی اسکا مادہ امن ہے اور واقعی اسلام امن کا علمبردار ہے۔ جو شخص محض زبانی کلامی مسلمان نہ ہو۔ بلکہ صحیح معنوں میں ایمان لے آئے تو نہ صرف خود امن میں آجاتا ہے بلکہ معاشرے کے دوسرے افراد بھی اس سے مامون ہوجاتے ہیں اور جس معاشرے میں اسلامی قانون نافذ ہوتے ہیں۔ وہ معاشرہ مکمل طور پرامن وسکون کا گہوارہ ہوتا ہے۔عہدِ نبویؐ کا مبارک دور اور خلفائے راشدین کا سنہری دور اس کی روشن ترین مثالیں ہیں۔

اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور زندگی کے ہر پہلو کے لئے ہدایات دیتا ہے اور اس ہمہ گیر حدیث کا نام ہی شریعت ہے۔قرآن پاک میں ہمیں حکم دیا گیا ہے۔کہ پوری شریعت کا اتباع کریں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **یایھا الذین امنو ادخلوا فی السلم کافۃ** (البقرۃ ۲۰۸)

ترجمہ: اے ایمان والو اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔

جب زندگی کے ہر گوشے میں اللہ تعالیٰ کا حکم نافذ ہوگا۔تو کسی کی حق تلفی نہ ہوگی۔نتیجتاً معاشرے میں امن ہوگا۔

ان الحکم الا للہ (یوسف ۴۰)

(سن رکھو) قانون اور حکم خدا کے سوا کسی کے لئے نہیں

الا لہ الخلق والا مر (الاعراف ۵۴)

ترجمہ: خبردار تخلیق اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کے لئے۔

اسلامی ریاست میں شہریوں کو یہ حقوق حاصل ہیں

1۔جان و مال اور ناموس کی حفاظت:

ریاست یہ ضمانت دیتی ہے کہ اپنے شہریوں کے جان، مال اور ناموس پر ہاتھ نہ ڈالے گی اور نہ کسی کو ڈالنے دے گی۔حضورؐ کا ارشاد ہے۔

فذالک المسلم الذی لہ ذمہ اللہ ورسولہ فلا تخضرو اللہ فی ذمتہ (بخاری)

ترجمہ: پس یہ وہ مسلم ہے جس کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے۔تو خبردار اللہ کے ساتھ اس کی دی ہوئی ضمانت میں غداری نہ کرو۔

کل المسلم علی المسلم حرام دمہ و مالہ وعرضہ (مسلم)

ترجمہ: مسلمان کی ہر چیز مسلمان پر حرام ہے۔اس کا خون بھی اسکا مال بھی اس کی آبرو بھی۔

اسی طرح غیر مسلم شہریوں کے باب میں یہ اصول ہے۔

''جو کوئی بھی ہمارا ذمی ہو اسکا خون بھی ہمارے خون کی طرح، اس کی دیت ہماری دیت کی طرح، اور اسکا مال بھی ہمارے مال کی طرح ہوں گے۔

2۔شخصی آزادی

ہر شخص کی انفرادی آزادی محفوظ ہوگی۔ جب تک کہ وہ اپنی آزادی کو دوسروں کی آزادی سلب کرنے یا جماعت کے کسی مفاد کو نقصان پہنچانے یا خطرے میں ڈالنے کے لئے استعمال نہیں کرتا۔

3۔رائے اور مسلک کی آزادی

اسلام ہر شخص کو اپنی آزاد رائے رکھنے کی اجازت دیتا ہے

بشرطیکہ وہ اسے خون ریزی اور فساد کا ذریعہ نہ بنائے۔

4۔قانونی مساوات

تمام شہری خواہ امیر ہوں یا غریب، سیاہ ہوں یا سفید، صاحبِ امر ہوں یا مامور، قانون کی نگاہ میں برابر ہوں گے۔

5۔معاشرتی مساوات:

خون، رنگ، نسب، زبان، پیشہ، معاشی مقام وغیرہ کی بناء پر شہریوں کے درمیان کوئی امتیاز نہ ہوگا۔عزت وشرف اگر ہے تو صرف تقویٰ کی بنا پر۔

6۔بے لاگ اور بے معاوضہ انصاف

اسلامی ریاست پر شہری کو ہر قسم کے ظلم اور زیادتی سے بچائے گی۔اور حصول انصاف کا انتظام بلا معاوضہ کرے گی۔

7۔فریاد، اعتراض اور تنقید کا حق

تمام شہریوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ پوری آزادی کے ساتھ اپنی بات باب اختیار تک پہنچائیں، اپنی مجبوریاں اور مسائل ان کو بتائیں، ان کی پالیسیوں پر اعتراض اور تنقید کریں۔

8۔اجتماع، تنظیم اور حرکت کی آزادی

انہیں یہ بھی حق حاصل ہوگا کہ منظم ہو کر کام کریں اور بلا روک ٹوک ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوں۔ساتھ ہی شہریوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ صحیح بات کو قبول کریں اور اطاعت کریں اور ریاست کی خیر خواہی کریں۔

جس ریاست میں اسلام کے عطا کردہ یہ تمام حقوق نافذ ہوں تو کیا وہ امن وآشتی کا نمونہ نہ ہوگی؟ اور اسی پُر امن معاشرے کے بطن سے خوشحالی جنم لیتی ہے۔

خوشحالی:

خوشحالی کا مفہوم ہرگز یہ نہیں کہ محض پیداوار میں اضافہ ہو جائے اصل مفہوم ایک خوشحال اور بہتر معاشرے کی تشکیل ہے۔قرآن بڑے بلیغ انداز میں بیان کرتا ہے۔**یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ** 9 **فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔** (الجمعۃ ۱۰۔۹)

ترجمہ: مسلمانو جب جمعہ کے دن نماز کے لئے اذان دی جائے۔ تو تم اللہ کی یاد کی طرف دوڑو۔اور لین دین چھوڑ دو۔اگر تم جانتے ہو تو یہی تمہارے لئے بہتر ہے پھر جب نماز ختم ہو جائے تو تم زمین پر پھیل جاؤ۔اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللّٰہ (النور ۳۷)

ترجمہ: وہ لوگ جنہیں خرید وفروخت اور تجارت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی اسلام نے ساری زمین بلکہ پوری کائنات کو انسان کے لئے میدان عمل قرار دیا اور انسان کو ترغیب دی کہ وہ اپنے معاش کے حصول اور خلق خدا کے لئے، فارغ البالی کے حصول کے لئے۔زیادہ سے زیادہ جدوجہد کرے، ارشاد باری ہے۔

ولقد مکنکم فی الارض وجعلنا لکم فیھا معایش (اعراف ۱۰)

ترجمہ: اور بے شک ہم نے تم کو زمین پر رہنے کی جگہ دی اور اسمیں تمہارے لئے سامانِ معاش پیدا کئے **الم تروا ان اللّٰہ سخر لکم ما فی السموت وما فی الارض اور اواسبغ علیکم نعمہ ظاہرۃ وباطنۃ** (لقمان ۲۰)

ترجمہ: کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے اور اس نے تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔اسی طرح اسلام نے انسانوں کو مختلف طریقوں سے محنت، معاشی جدوجہد اور حصولِ رزق کی کوشش پر اکسایا ہے۔بے عملی بے روزگاری اور گداگری کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا اور اس پر سخت وعید سنائی گئی۔ایک حدیث میں ہے کہ رسولؐ

نے فرمایا۔

تم میں سے کسی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے اور رزق تلاش نہ کرے اور یہ کہتا رہے کہ اللہ مجھے رزق عطا فرما۔ تم کو (دعا کے ساتھ) اسکے لئے جدوجہد بھی کرنی چاہیے۔ کیونکہ تم جانتے ہو کہ آسمان تو سونا نہیں برساتا۔ ایک اور حدیث میں رسولؐ نے فرمایا جب تم فجر کی نماز پڑھ لو تو اپنی روزی کی تلاش سے غافل ہو کر سوتے نہ رہو۔ (کنز العمال)

ایک اور حدیث میں فرمایا:

دنیا کی شرافت غنا اور فراغ دستی میں ہے اور آخرت کی شرافت تقویٰ اور پرہیز گاری ہے، اور خود رب العزت کا ارشاد ہے۔

ولا تنس نصیبک من الدنیا (القصص ۲۲)

ترجمہ: اور دنیا سے اپنا حصہ لینا نہ بھولو۔

نبیؐ نے کسب حلال کو "**فریضۃ بعد الفریضۃ**" یعنی نماز کے بعد سب سے بڑا فرض قرار دیا ہے۔

حضورؐ نے ایک صحابی کو دیکھا جو خستہ حال تھے آپؐ نے ان سے پوچھا تمہارے پاس کچھ ہے۔ انہوں نے بتایا دو درہم ہیں۔ آپؐ نے ان میں سے ایک درہم کی کلہاڑی خریدی اور انہیں لکڑیاں کاٹنے پر لگا دیا۔ اس طرح محنت کی ترغیب دی۔

حرمتِ سود:

سود جو معاشی ظلم کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اسلام نے اسے حرام قرار دیا اور اسکے لینے کو خدا اور اسکے رسولؐ کے خلاف جنگ قرار دیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

یایھا الذین امنوا لا تاکلوا الربوٰا اضعافاً مضعفہ واتقوا اللّٰہ لکم تفلحون (آل عمران ۱۳۰)

ترجمہ: اے ایمان والو بڑھتا چڑھتا سود نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ اس کے برعکس زکوٰۃ کا بے نظیر نظام دیا تاکہ معاشرے کے پسے ہوئے طبقے کو بھی اپنے پیروں پر کھڑا کیا جا سکے، دولت امیروں میں ہی گردش نہ کرتی رہے اور امیر اور غریب میں باہمی نفرت کے بجائے محبت اور اخوت کے جذبات پرورش پا سکیں۔ زکوٰۃ کے علاوہ مصدقات، انفاق، قانون وراثت، العفو جیسے احکام دے کر معاشرے کو عدم توازن کا شکار ہونے سے روکا تاکہ خوشی اور خوشحالی صرف امیروں ہی کا مقدر بن کر نہ رہ جائے۔

یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے امن و محبت خوشی اور خوشحالی کے مذہب اسلام کا جو ایک طویل عرصہ تک دنیا کے ایک بڑے حصے پر حکومت کرتا رہا فتوحات کا عالم یہ تھا کہ اسلامی سلطنت میں سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ لیکن یہ فتوحات تلوار کی نوک پر محض خطۂ زمین کی فتوحات نہ تھیں بلکہ اسلام کی آفادیت نے لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیا تھا۔

اس مختصر سے مضمون میں تاریخ کے تمام سنہری ابواب تو سموئے نہیں جا سکتے، لیکن جب محمد بن قاسم سندھ سے رخصت ہونے لگا تو سندھ کے ہندو رونے لگے اور انہوں نے اس کے بت بنا کر پوجنا شروع کر لئے۔ افسوس کہ آج ہم دین سے دوری کے سبب دنیا میں دہشت گرد قرار پائے اور نتیجتاً خوشحالی اور امن رخصت ہوا آج ہم کاسہ گدائی لئے غیروں سے نظام کی بھیک مانگ رہے ہیں جس سے امن قائم اور خوشحالی کا دور دورہ ہو۔ حالانکہ نسخۂ کیمیا تو جز دان لپٹا ہمارے طاقوں میں سجا ہے۔

☆......☆......☆

عائشہ ایاز

کرپشن، بربادی کا راستہ

کرپشن کا اردو میں مفہوم بدعنوانی، بدکاری، بدعملی، بداخلاقی اور بگاڑ کا ہے۔عربی میں اس کا مفہوم لفظ فساد سے ممکن ہے۔کرپشن سے معاشرے میں بد اخلاقی اور بدعنوانی پیدا ہوتی ہے۔جس سے معاشرے میں فساد پھیلتا ہے۔ہمارے ہاں کرپشن کا عمومی مفہوم مالی بد عنوانی اور اپنے اختیارات سے تجاوز کرنے کا ہے۔

کرپشن پر مبنی یہ افعال اللہ کی میزان میں گناہ ہیں۔اللہ دنیا اور آخرت میں ان پر اپنی مشیت کے مطابق گرفت کرے گا۔عوام کے حقوق پر ڈاکہ زنی محض توبہ سے معاف نہیں ہوسکتی۔جب تک حق تلفی کا شکار ہونے والوں کو انکا حق نہ مل جائے یا وہ خود معاف نہ کردیں۔

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا، رشوت لینے اور دینے والے پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے۔(صحیح بخاری و مسلم)

حضرت شعیب علیہ السلام کی زبان میں ناپ تول میں کمی اور تجارت میں بے ایمانی کو زمین میں فساد جیسا جرم قرار دیا اور اللہ کے عذاب کا لازمی سزاوار۔

''اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو۔آج میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں مگر مجھے ڈر ہے کہ کل تم پر ایسا دن آئیگا جس کا عذاب سب کو گھیرے گا۔

اے برادران قوم! ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ پورا ناپو اور تولو اور لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دیا کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔(سورۃ ہود 85-84)

حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے خلافت کا حلف لیتے ہی اپنے اپنے انداز میں اس امر کا اعلان کیا اور پورے دور خلافت میں اس پر عمل کیا کہ طاقت ور اور کمزور کے فرق کو معاشرے میں ختم کردیں گے۔جس کا بھی جو حق ہے، خواہ وہ کمزور ہی کیوں نہ ہو اس کو پہنچا کر دم لیں گے ان کی نگاہ میں کوئی ایسا طاقتور نہیں ہوگا جو دوسروں کے حق پر ناجائز قابض ہوجائے اور خلیفۃ المسلمین اس غاصب سے حق لے کر کمزور کو نہ لوٹا دیں یہ ہے دادرسی اور خود اختیاری (Empowerment) کا وہ ہدف اور ذمہ داری جو اسلام نے مسلمانوں کے حکمرانوں کو سونپی ہے۔یہی وہ اعلیٰ نظام ہے جس کے ذریعے زندگی میں ہر سطح پر کرپشن کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے، تمام انسانوں کے درمیان انصاف اور ایک دوسرے کے حقوق کی مکمل پاس داری کی ضمانت مل سکتی ہے، اور امانت و دیانت کے ساتھ معاشی و سرکاری امور کی ادائیگی اور لوگوں کے لئے جان و مال، عزت کا تحفظ اور بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی کا اہتمام ہوسکتا ہے۔

اپنے وسیع مفہوم میں کرپشن کی ایک شکل فکری اور اعتقادی بھی ہے۔انفرادی سطح پر فرد کے اخلاق اور شخصیت و کردار کے انتشار سے اس کا تعلق بنتا ہے۔تخلیق آدمؑ کے وقت فرشتوں نے انسان کے وجود سے جس خوف کا اظہار ''فساد فی الارض'' کے الفاظ میں کیا تھا، غالباً اس کا اظہار کرپشن پر مبنی رویہ ہی ہے جس سے مزید بگاڑ یعنی حق تلفی باطل پرستی، ظلم کا ارتکاب اور حدود کی پامالی واقع ہوتے ہیں۔

ملک میں معاشی، سیاسی، انتخابی اور اخلاقی کرپشن کا ناسور قومی سلامتی کیلئے خطرناک شکل اختیار کرگیا ہے۔بے انتہا غربت، مہنگائی، بے روزگاری اور بدامنی کی جڑ موجودہ کرپٹ سسٹم ہے۔جس کی وجہ سے بے انتہا قدرتی وسائل رکھنے والا ملک اور صلاحیتوں سے مالا مال جفاکش اور محنتی قوم ہونے کے باوجود ہمارے معاشرے میں غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہورہا ہے

۔آئین پاکستان میں عام شہری کو عزت کی روٹی تعلیم، علاج اور رہائش دینے کی ضمانت دی گئی ہے مگر کرپٹ حکومتوں نے ان بنیادی حقوق سے شہریوں کو محروم رکھا ہوا ہے۔

کرپشن اپنی مختلف شکلوں میں موجود اور فراواں ہے ۔فکری اور نظریاتی کرپشن اخلاقی اور معاشی کرپشن سیاسی اور قانونی کرپشن اور اداراتی کرپشن۔

اخلاقی کرپشن کا حال یہ ہے کہ ہمارے بڑے بڑے ادارے فحاشی روکنے کے بجائے فحاشی کی تعریف کی بحث میں الجھے ہوئے ہیں جو ظاہر ہے کہ اللہ رب العزت کے غضب کو بھڑکانے والی بات ہے۔اس وقت عالم یہ ہے کہ زندگی کے جس شعبے پر نظر ڈالیں کرپشن کی گرم بازاری کا سماں نظر آتا ہے۔میڈیا جس کا کام سچ کو جھوٹ سے الگ کر کے عوام کے سامنے رکھنا ہے، افسوس کہ اس ادارے میں بدعنوانی کا عمل دخل بہت بڑھ گیا ہے۔میڈیا اب ملٹی نیشنل کمپنیوں اور مفاد پرست سیاست دانوں کے ہاتھوں بک چکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میڈیا میں بہت کم افراد ایسے رہ گئے ہیں جو صحافت کو ایک مقدس فریضہ سمجھ کر ادا کر رہے ہوں۔اسی طرح عدلیہ میں بھی کئی عوامل ایسے ہیں جو اس ناسور کے پھلنے پھولنے میں مددگار ہیں۔مفاد پرستی، شخصی حکمرانی، سیاسی جانب داری اور پنجہ آزمائی مالیاتی لوٹ مار اور اداراتی کمزوری اور کشمکش کا دور دورہ ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکمرانوں اور عوام الناس کے درمیان ایک خلیج ہے، گویا کہ وہ مختلف دنیاؤں میں بس رہے ہیں اور ان میں یہ دوری روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔

23مارچ 1940ء ایک تاریخی لمحہ تھا جب پاک وہند کے مسلمانوں نے ایک روشن اسلامی مستقبل کا خواب دیکھا تھا پھر 14اگست 1947ء کو پاکستانی قوم نے بڑی قربانیاں دے کر قائداعظم کی قیادت میں جدوجہد کا ایک طویل اور کرب ناک سفر طے کیا تھا۔اس طرح اپنے خواب کی تعبیر کی پہلی کرن بچشم سر دیکھی تھی اور نئی زندگی کا نیا سفر شروع کیا تھا۔لیکن سات عشروں پر محیط یہ سفر بہت سے روشن سنگ ہائے میل کے باوجود ایک کرب ناک سفر رہا ہے۔قوم زبانِ حال سے اور دکھ بھرے انداز میں سوچنے پر مجبور ہے کہ ؎

وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

مایوسی کفر ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ زمانہ بدلتا ہے۔ہر قوم پر اور خود ہم پر بار بار برا وقت آیا ہے، لیکن ہر نشیب کے بعد فراز اور ہر رات کے بعد صبح نو طلوع ہوتی ہے۔یہی اللہ کی سنت ہے اور وہ لوگوں کے درمیان زمانے کو اپنی حکمت کے مطابق گردش دیتا رہتا ہے۔پھر اس میں یہ بھی حکمت ہے کہ کبھی رات چھوٹی ہوتی ہے اور کبھی لمبی لیکن بالآخر سپیدہ صبح رونما ہوتا ہے۔

البتہ یہ بھی اللہ کی سنت ہے کہ تبدیلی خود بخود نہیں آتی۔اس کے لئے کوشش اور جدوجہد کرنا ہوتی ہے۔صحیح منزل کا تعین، حالات کا دیانت دارانہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ لینا ہوتا ہے۔ترقی اور بگاڑ کے اسباب کا تعین کرنا ہوتا ہے۔حکمت عملی اور اہداف کا ادراک اور اس کے مطابق عمل کا نقشہ کار مرتب کرنا ہوتا ہے۔پھر ایمان اور احتساب کے ساتھ جدوجہد بھی کرنی ہوتی ہے۔مثبت تبدیلی اور منزل کی طرف پیش قدمی کا یہی راستہ ہے اور اسی جدوجہد کا نام جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

☆.....☆.....☆

میر بابر مشتاق

آج کا نوجوان

قوتوں، صلاحیتوں، حوصلوں، امنگوں، بلند پروازی اور عزائم کا دوسرا نام نوجوانی ہے۔ کسی بھی قوم، ملک کی کامیابی و ناکامی، فتح و شکست، ترقی و تنزلی، عروج و زوال میں نوجوانوں کا کردار اہم ہوتا ہے۔ ہر انقلاب خواہ وہ سیاسی ہو یا معاشی، روس کا انقلاب ہو یا فرانس کا، آج سے چودہ سو سال پہلے حضور اکرمؐ نے عرب کی زمین پر انقلاب برپا کیا جس کے اثرات آج بھی موجود ہیں، ان سب میں نوجوانوں نے ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔

ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے مطابق پندرہ سال سے لے کر چوبیس سال تک کی عمر کے فرد کو نوجوان کہا جاتا ہے (World Population Statistics) کی ایک تحقیق کے مطابق دنیا کی کل آبادی میں پچاس فیصد آبادی پچیس سال سے نیچے کی عمر پر مشتمل ہے۔ مذکورہ بالا تحقیق کی روشنی میں پاکستان کا تذکرہ کیا جائے تو ایک سروے کے مطابق پاکستان کو نوجوانوں کا ملک (Country of the youth) کا درجہ حاصل ہے۔

قرآن مجید اور نوجوان

نوجوانوں کی اہمیت کے بارے میں قرآن مجید اصحابِ کہف کے حوالے سے نوجوانوں کا کردار اس طرح بیان کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''ہم ان کا قصہ تمہیں سناتے ہیں وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے ہم نے ان کو ہدایت بخشی''

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى (سورہ الکہف) یہ وہ نوجوان تھے جنہوں نے وقت کے ظالم حکمراں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر رب العالمین پر ایمان لا کر حق پرستی کا اعلان کیا۔

اللہ تعالیٰ ان کے عزم و حوصلے اور غیر متزلزل ایمان اور ان کے عالمگیر اعلان کے بارے میں اس طرح فرماتا ہے۔ **وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا (سورہ الکہف)** ہم نے ان کے دل اس قدر مضبوط کر دیئے جب وہ اٹھے اور انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ ہمارا رب بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بالکل بے جا بات کریں گے۔ ان چند نوجوانوں نے اپنے زمانہ میں جو رول ادا کیا وہ تمام نوجوانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے۔ اسی طرح سے قرآن مجید نے حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانے والے چند نوجوانوں کا تذکرہ کیا۔ حضرت موسیٰؑ کو قوم نے ہر طرح سے جھٹلایا لیکن وہ چند نوجوان ہی تھے جنہوں نے کٹھن حالات میں حضرت موسیٰؑ کی نبوت پر ایمان کا اعلان کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ **فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ (یونس)** ''موسیٰؑ کو اسی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا، فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے سربراہ لوگوں کے ڈر سے کہ فرعون ان کو عذاب میں مبتلا کرے گا''۔ مذکورہ بالا آیت میں ذریۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو بہت ہی جامع اور معنی خیز ہے۔ سید مودودیؒ نے ذریۃ کی تشریح پر مغز انداز میں اس طرح کی ہے ''متن میں یہ الفاظ ذریۃ استعمال ہوا ہے جس کے معنی اولاد کے ہیں۔ ہم نے اس کا ترجمہ نوجوان سے کیا ہے۔ دراصل اس خاص لفظ کے استعمال سے جو بات قرآن مجید بیان کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ اس

پُرخطر زمانے میں حق کا ساتھ دینے کی جرأت چند لڑکوں اور لڑکیوں نے تو کی مگر ماؤں اور باپوں اور قوم کے سن رسیدہ لوگوں کو اس کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ان پر مصلحت پرستی اور دنیوی اغراض کی بندگی کچھ اس طرح چھائی رہی کہ حق کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوئے جس کا راستہ ان کو خطرات سے پُرنظر آرہا تھا۔(ترجمہ قرآن مع مختصر حواشی)

نبی مہربانؐ اور نوجوان

حضور اکرمؐ نے جب دعوت حق کا آغاز کیا تو ابتداء میں نوجوانوں نے آپؐ کی آواز پر لبیک کہا۔جوانی کی عمر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بڑی نعمت ہے۔اِس لئے خصوصی طور پر قیامت کے دن اس حوالے سے پوچھا جائے گا۔حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا!**لا تزول قدما ابن آدم حتی یسئل عن خمس عن عمرہ فیما افناہ وعن شبابہ فیما ابلاہ وعن مالہ من این اکتسبہ وفیما انفقہ وماعمل فیما علم(ترمذی باب صفۃ القیامۃ)** یعنی قیامت کے دن انسان کے قدم اپنی جگہ سے ہٹ نہ سکیں گے یہاں تک کہ اس سے پانچ باتوں کے بارے میں سوال نہ کرلیا جائے۔عمر کن کاموں میں گنوائی۔جوانی کی توانائی کہاں صرف کی۔۳۔مال کہاں سے کمایا۔۴۔اور کہاں خرچ کیا۔۵۔جو علم حاصل کیا اس پر کہاں تک عمل کیا۔

اس حدیث مبارکہ میں چار سوال جوانی سے متعلق ہیں۔ایک عمر کے بارے میں سوال کیا جائے گا اس میں جوانی کا دور بھی شامل ہے۔مال کمانے کا تعلق بھی اسی عمر سے شروع ہوتا ہے۔حصول علم کا تعلق بھی اسی عمر سے ہے۔نوجوانی کی عمر صلاحیتوں کو پیدا کرنے اور اس میں نکھار پیدا کرنے کی ہوتی ہے۔اسی عمر میں نوجوان علوم کے مختلف منازل طے کرتا ہے یہی وہ عمر ہے جس میں نوجوان علمی تشنگی کو اچھی طرح سے بجھا سکتا ہے۔

عمر کے اسی مرحلے میں نوجوان صحابہؓ نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔یہی وہ عمر ہے جس میں اسامہؓ بن زیدؓ نے قیادت کی ذمہ داری سنبھالی یہی وہ عمر ہے جس میں خالدؓ بن ولید نے بارگاہ نبوت سے سیف اللہ کا لقب حاصل کیا۔دور شباب ہی میں حضرت علیؓ حضرت مصعبؓ بن عمیر،عمارؓ بن یاسر،اور چار عباداللہ جن میں ابن عمرؓ،ابن عباسؓ،ابن زبیرؓ ابن العاصؓ نے اللہ کے رسولؐ سے شانہ بشانہ عہد و پیمان باندھا اسی عمر میں ابن تیمیہؒ،شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی،اور امام غزالیؒ جیسے مجددین علوم کی گہرائیوں میں اترے،اسی دور شباب میں صلاح الدین ایوبیؒ،طارق بن زیادؒ اور محمد بن قاسمؒ نے اسلامی تاریخ کو اپنے کارناموں سے منور کیا۔اسی عمر میں حسن البناءؒ شہید نے مصر کی سرزمین کو جہاں فرعون کے نقوش ابھی بھی باقی ہیں، دعوت الی اللہ کے لئے مسکن بنایا۔مولانا ابوالکلام آزادؒ نے صحافت کا میدان نوجوانی ہی میں اختیار کیا اور سید مودودیؒ نے تئیس سال کی عمر میں ہی الجہاد فی الاسلام جیسی معرکہ الکتاب لکھ کر تمام غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جن کا اس وقت نہ صرف غیر مسلم بلکہ مسلمان بھی شکار تھے۔

اللہ کے رسولؐ نے اسی عمر کو غنیمت سمجھنے کی تلقین کی ہے۔کیونکہ بڑے بڑے معرکے اور کارنامے اسی عمر میں انجام دیئے جاسکتے ہیں۔حضرت عمر بن میمونؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ اللہ کے رسولؐ نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو ایک جوانی کو بڑھاپے سے پہلے ۲۔صحت کو بیماری سے پہلے ۳۔خوشحالی کو ناداری سے پہلے ۴۔فراغت کو مشغولیت سے پہلے ۵۔زندگی کو موت سے پہلے (ترمذی)۔

مقصد زندگی

دور حاضر میں جب نوجوانوں سے اِن کا مقصدِ زندگی پوچھا جائے تو وہ حیران ہوکر جواب دیتے ہیں کہ یہ کیسا سوال ہے۔مجھ سے تو آج تک کسی نے اس طرح کا سوال نہیں کیا۔میری زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے اور زندگی کا کوئی مقصد بھی ہوتا ہے؟ آج کے نوجوانوں کا مقصد(Eat, Drink and be Happy)اور بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست(خوب عیش کرلے کیونکہ عالم دوبارہ نہیں ہے)جیسے پُرفریب نعروں پر نہ صرف یقین رکھتے ہیں بلکہ عمل بھی کرتے ہیں۔

اسلام کا مقصدِ زندگی کے حوالے سے واضح موقف ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے اِس کی بھرپور راہنمائی فرمائی ہے۔ قرآن پاک میں ایک جگہ انسان کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ **انی جاعل فی الارض خلیفه** تو دوسری جگہ **وماخلقت الجن والانس الالیعبدون** کہہ کر اللہ تعالیٰ نے واشگاف الفاظ میں زندگی کا مقصد ومدعا بیان کیا ہے۔ ایک جگہ اگر حسنِ عمل کو مقصد زندگی قرار دیا ہے "**اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً**" دوسری جگہ مقصد اور کامیاب زندگی کو تزکیہ نفس پر موقوف ٹھہرایا گیا ہے "**قدافلح من تزکی**" زندگی کی غرض وغایت کے متعلق احادیث سے بھی خوب رہنمائی ملتی ہے۔ اللہ کے رسولؐ کا ارشاد ہے **ان الدنیا خلوۃ خضرۃ وان اللہ مستخلفکم فیہافینظر کیف تعملون** (مسلم کتاب الذکر) یعنی دنیا بہت مٹھاس والی اور سرسبز وشاداب ہے اللہ تعالیٰ نے اس میں تمہیں خلافت کا منصب عطا کیا ہے تا کہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ اللہ کے رسولؐ نے یہ بھی فرمایا **الکیس من دان نفسه وعمل لمابعدالموت** (ترمذی) یعنی عقل مند وہ ہے جس نے اپنے نفس کا محاسبہ کیا اور موت کے بعد والی زندگی کیلئے عمل کیا۔

احکامات الٰہی سے دور نوجوان

دورِ حاضر میں اُمتِ مسلمہ کے نوجوان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ احکامات الٰہی سے دوری اختیار کیے ہوئے ہے۔ قرآن مجید کو ایک رسمی کتاب سمجھتا ہے۔ اِس کتاب کے متعلق اِس کا تصور یہ ہے کہ اس کے ساتھ اگر تعلق قائم کر بھی لیا جائے تو محض زیادہ سے زیادہ تلاوت قرآن پاک تک محدود رہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ کتاب دورِ حاضر کے چیلنجز کا مقابلہ کرنے کی اہلیت اور صلاحیت نہیں رکھتی ہے لیکن حقیقت اِس کے برعکس ہے۔ قرآن مجید کتاب انقلاب ہے۔ یہ نہ صرف عصرِ حاضر کے چیلنجز کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے بلکہ تمام مسائل کا حل بھی فراہم کرتی ہے۔

قرآن جہاں انسانوں کو آفاق کی سیر کراتا ہے وہیں یہ انفس کی ماہیت وحقیقت سے بھی روشناس کراتا ہے۔ جہاں عبادت کے بارے میں رہنمائی کرتا ہے وہیں سیاسی معاملات کے لئے راہنما اصول بیان کرتا ہے۔ جہاں اخلاقی تعلیمات کے بارے میں راہنمائی کرتا ہے وہاں اقتصادی نظام کے لئے ٹھوس بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ یہ جہاں حلال وحرام کے درمیان تمیز سکھاتا وہاں یہ حق وباطل کے درمیان فرق کی صلاحیت بھی پیدا کرتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے قرآن کو اپنی زندگی کا امام بنایا جائے۔ یہ آپ کو دنیا کا امام بنادے گا۔

سوشل میڈیا اور نوجوان

انٹرنیٹ اور موبائل دورِ حاضر کی اہم ضرورت بن چکی ہے۔ تعلیمی وتحقیقی کاموں اور رابطہ کے لئے اِس کا استعمال ناگزیر ہو چکا ہے۔ معاشرے میں بڑھتی ہوئی بے حیائی اور اخلاقی قدروں کی تباہی بھی اِس کی مرہونِ منت ہے۔ نوجوانوں میں اِس کا بے تحاشا بڑھتے ہوئے رجحان نے اُن کی جنسی خواہشات کو برانگیختہ کر دیا ہے۔ انٹرنیٹ پر ان گنت حیاسوز ویب سائٹس جن تک ہر نوجوان باآسانی رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ گھر سے لے کر کالج تک اور کالج سے لے کر بازار تک بے حیائی پر مبنی ماحول نے نوجوانوں کے اخلاق کا دیوالیہ نکال دیا ہے جس کی بدولت آج کا نوجوان خوف، تناؤ، ذہنی اور نفسیاتی امراض کا شکار ہو چکا ہے۔ امتِ مسلمہ کے اِس گراں قدر سرمایے کو اطمینانِ قلب، تطہیر ذہن، حیاپسندی، پاک دامنی اور حسنِ اخلاق سے نوجوانوں کو متصف کرانا وقت کا ایک تجدیدی کام ہے۔ اسلام کی اساسیات اور اِس کے نظام وحقائق اور رسالت محمدیؐ کا وہ اعتماد واپس لایا جائے جس کا رشتہ آج کے نوجوان سے چھوٹ چکا ہے۔ آج کا سب سے بڑا جہاد، عبادت اسی فکری اضطراب اور نفسیاتی اُلجھنوں کا علاج کرنا ہے جس میں آج کا تعلیم یافتہ نوجوان مبتلا ہے۔

نوجوان اور مستقبل کی تلاش

قوم کی تعمیر وترقی بہتر مستقبل کی بنیاد نظام تعلیم پر ہے۔ ایک فلسفی کا قول ہے کہ اگر قوم کے مستقبل کے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو مجھے اپنا نظام تعلیم دکھاؤ میں بتا سکتا ہوں کہ اِس کا مستقبل کیسا ہوگا۔

عصر حاضر میں تعلیم کا مقصد صرف اور صرف پیشہ (Profession) مقام (Placement) اور پیسہ وسرمایہ (Payment) کا ذریعہ بن گیا ہے۔ ہرنوجوان اِن تین چیزوں کے پیچھے بھاگتا ہے۔ آگے بڑھنے اور کیریئر پلاننگ کی دُھن نے ایسا ماحول پیدا کردیا ہے کہ کیریئر کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے دن رات ایک کردیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُسے اپنے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے مقصدِ وجود سے لاعلم ہے۔ وہ قابل ذکر اسناد (Degrees) کا حامل ہوتا ہے لیکن دوسروں کے لئے اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ نہیں ہوتا۔ اِس کے پاس معلومات کا وافر خزانہ موجود ہوتا ہے لیکن عمل کی دنیا سے وہ اتنا ہی دور ہوتا ہے۔ اس کی مثال اِس گدھے کی طرح ہے جس کی پیٹھ پر کتابوں کا بوجھ لاد دیا جائے لیکن بیچارے گدھے کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی پیٹھ پر کس قسم کا بوجھ لاد دیا گیا ہے۔ اسلام کیریئر اور مستقبل کو خوب سے خوب تر بنانے اور نکھارنے سے منع نہیں کرتا ہے۔ اسلام تو قاعدے اور سلیقے کے ساتھ منظم اور اچھے طریقے سے کیریئر بنانے پر زور دیتا ہے۔ اور اس بات کی بھی تلقین کرتا ہے کہ احسان ''حسن عمل'' (Excellence) کسی بھی لمحے آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے پائے اس کے برعکس اسلام جس چیز سے منع کرتا ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے لوگوں سے منہ پھیر کر زندگی گزارے، اندھی کیریئر پرستی میں مشغول رہے جو ایک نوجوان کو معاشرے سے الگ تھلگ کردیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس حوالے سے حضرت لقمان کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا **ولا تصعر خدک للناس (لقمان)** ''اور تم لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کرو'' ''صعر'' اصل میں ایک بیماری کا نام ہے جو عرب میں اونٹوں کو لگ جاتی ہے تو وہ اپنی گردن کو دائیں بائیں گھما نہیں سکتا بالکل اسی طرح کیریئر پرستی کے شکار نوجوانوں کا عمومی رویہ ہوتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنی زندگی کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات کی روشنی میں اپنے مستقبل کا تعین کیا جائے کہ اس میں ہی دنیا اور آخرت کی کامیابی ہے۔

نوجوانوں کے مسائل اور حل

آج امت کا نوجوان بے شمار مسائل اور الجھنوں میں گھرا ہوا ہے۔ ایک طرف غیر متوازن نظام تعلیم کے مسائل کا سامنا کررہا ہے تو دوسری طرف اقتصادی مسائل سے دوچار ہے۔ ایک طرف اگر وقت پر نکاح نہ ہونے کے مسائل تو دوسری طرف بے روزگاری کے مسائل نے پریشانیوں میں مبتلا کررکھا ہے۔ ایک طرف ناقص تعلیم وتربیت حیا سوز ،مغربی فکر وتہذیب کے پیدا کردہ مسائل اور دوسری طرف الجھنوں کا انبار لگا ہوا ہے۔ جن سے امت کا یہ اہم طبقہ دوچار ہے۔ یہ واضح رہے کہ آج کا نوجوان طبقہ مسائل کا سامنا کرنے سے کتراتا بھی ہے۔ کیونکہ ان کو اس سلسلے میں مطلوبہ رہنمائی نہیں مل پارہی ہے تاکہ وہ ان مسائل سے باآسانی نبرد آزما ہوسکیں۔ اس سلسلے میں ماں باپ، علماء اور دانشوروں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مربیانہ کردار ادا کریں تاکہ نوجوان طبقہ مستقبل میں ملت اور معاشرے کی تعمیر واصلاح کے لیے مؤثر کردار ادا کرسکے۔ اس حوالے سے اللہ کے رسولؐ کا وہ تربیتی نظام سامنے رکھنا چاہئے جس کی بدولت انہوں نے نوجوانوں کی ایک بہترین ٹیم تیار کی تھی ،جس نے بعد میں بڑے بڑے معرکے سرانجام دیئے۔ اللہ کے رسولؐ نوجوانوں کی ان کے رجحان اور طبیعت کو مدنظر رکھتے ہوئے تربیت کرکے ان کو مختلف ذمہ داریاں سونپتے تھے۔ اللہ کے رسولؐ کا تربیتی نظام بڑا شاندار اور منفرد انداز کا ہے۔ آپؐ اُن کی کردار سازی پر بہت توجہ فرماتے تھے، اس کے لیے آپ نہ صرف ان کے خارجی بلکہ ان کے نفسیاتی مسائل بھی حل کرتے تھے۔ ایک دن قریش کا ایک نوجوان رسولؐ کی خدمت میں آیا اور بلاخوف وتردد عرض کیا، اے اللہ کے رسولؐ مجھے زنا کی اجازت دے دیجئے۔ صحابہ کرامؓ اس نوجوان کی بے ہودہ جسارت پر بپھر گئے اور اس کو سخت سے سخت سزا دینا چاہی مگر رسولؐ نے بالکل منفرد انداز اختیار کیا۔ آپؐ نے اس نوجوان کو قریب بلایا اور کہا کیا تم یہ بات اپنی ماں کے لیے پسند کرتے ہو؟ نوجوان نے کہا میری جان آپؐ پر قربان ہو یہ بات میں اپنی ماں کے لیے کبھی پسند نہیں کرسکتا۔ پھر آپؐ نے اس کی بہن، پھوپھی اور خالہ

ستارہ منصور

پہلا وہ گھر خدا کا

مکۃ المکرمہ اور بیت اللہ کے بارے میں ایک معلوماتی تحریر

کے بارے میں یہی سوال دہرایا۔ وہ ہر بار یہی کہتا میری جان آپؐ پر قربان ہو خدا کی قسم یہ بات میں ہرگز پسند نہیں کر سکتا۔ پھر آپؐ نے اس نوجوان کو اپنے پاس بلایا اور اس کے لیے اللہ سے دعا کی جس کے بعد وہ کبھی بھی اس بے ہودہ کام کی طرف مائل نہیں ہوا (مسند احمد)۔ اس واقعے سے ہم کو بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ نوجوانوں کے نفسیاتی مسائل کو کس طرح پیار سے سمجھانے اور حل کرنے کی ضرورت ہے۔☆

شاید ہی کوئی مسلمان ہو جس کے دل میں اللہ کے گھر جانے کی تمنا اور تڑپ نہ ہو اور وہ اسلام کے اس عظیم رکن کی ادائیگی سے عہدہ برآ ہونے کے افضل جہاد کی مشقت سے نہ گزرنا چاہتا ہو۔ جب بھی حج کی فرضیت کے بارے میں آیت نظر سے گذرتی تو استطاعت کا لفظ مجھے بہت پریشان کر دیتا، جی چاہتا کہ میں جلد از جلد دنیاوی جھمیلوں فرائض سے چھٹکارا پاؤں اور اپنے رب کے حضور حاضر ہوں۔

بالآخر اس کے فضل و کرم سے یہ دن بھی آن پہنچا۔ لاہور سے جدہ تک کا سفر شروع کرتے ہوئے دل میں انجانی خوشی اور حبِ الٰہی اور خشیت الٰہی کی ملی جلی کیفیت محسوس کی اپنا آپ گویا ایک طالب علم کی مانند لگا جس نے نہ تو ہوم ورک پورا کیا، حاضریاں بھی ادھوری اور امتحان کی تیاری بھی نامکمل، کارکردگی کی لسٹ بھی استادِ محترم کے پاس موجود ہو۔

انہی خیالوں میں گم تھی کہ جہاز کی فضا مسافروں کی تلبیہ و توحید کے کلمات سے گونج اٹھی سوچا کہ اس کلمے میں کتنا جوش و جلال ہے نجانے اس گھر کو اپنے سامنے پا کر کیا کیفیت ہوگی؟ آنسوؤں کی لڑیاں پوری رفتار سے بہتی چلی جا رہی تھیں۔

مکہ میں پہنچ کر متعلقہ رہائش کی طرف روانہ ہوئے جو کہ نزہہ کے نام سے تقریباً مکہ سے نو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھی۔ صبح سویرے عمرے کے لئے نکلنا تھا۔ مشقت کا سفر ابھی شروع ہونا تھا۔ 8 ذوالحجہ کو مکہ سے منیٰ پہنچے منیٰ سے عرفات، وقوفِ عرفات جہاں ظہر و عصر ملا کر پڑھی۔ شام غروب آفتاب کے ساتھ ہی مزدلفہ پہنچے جہاں مغرب اور عشا کی نمازیں ادا کیں۔ علی الصبح نماز فجر کے بعد وقوف مزدلفہ پھر منیٰ واپس آ کر جمرہ کبریٰ کو کنکریاں مار کر قربانی سے فارغ ہوتے ہی مکہ طوافِ افاضہ کے لئے روانہ ہوئے۔ ایام تشریق تک قیام کرنا حج کے مناسک میں شامل ہے۔

مزدلفہ میں قیام کے دوران ذاتِ باری تعالیٰ سے محبت اور وارفتگی کا ایک الگ منظر دیکھنے میں آیا۔ عالم یہ تھا کہ ہر مسلمان خواہ امیر ہے یا غریب، ہر قومیت سے آنے والا ایک ایک فرد آج کی رات ایک ایسا مسافر بن گیا جس نے آرام دہ بستر اور سہولت سے بے نیاز ہو کر سڑک، کھائی، پہاڑیوں میں آڑی ترچھی زمین پر جس طرح رات گذاری اس کی مثال نہیں ملی۔ اسلام کی یہ اجتماعی عبادت واقعی بے مثال ہے دوران حج ایسی محبت اخوت تعاون اور قربانی کا جذبہ دیکھنے میں آیا وہ اسلام ہی کا خاصہ ہے اور میرے رب کا یہی حکم ہے۔

مکہ معظّمہ ایک مبارک شہر جس کو امن کا شہر قرار دیا گیا جس میں اللہ تعالیٰ کا بابرکت گھر خانہ کعبہ ہے جس شہر کے لئے فراوانیِ رزق اور برکت کی دعا مانگی گئی اور جو اپنے اندر دینی فضائل سمیٹے ہوئے ہے جہاں پوری دنیا سے مسلمان کھنچے چلے آتے ہیں جہاں نماز کا اجر ایک لاکھ گنا سے زیادہ ہے۔ میں نے سوچا کہ اس مبارک شہر کے بارے میں کچھ کتابوں اور لٹریچر کی مدد سے معلومات آسان فہم زبان میں اپنے پڑھنے والوں تک پہنچاؤں۔ ایسی مقدس سرزمین جس کے بارے میں حضورِ اکرمؐ نے حزورہ کے مقام پر کھڑے ہو کر فرمایا ''تو اللہ کی سب سے پسندیدہ سرزمین ہے ،اگر میں تیرے پاس سے نہ نکالا جاتا تو بالکل نہ نکلتا۔''

(حزورہ مکہ میں ایک ٹیلہ ہے جہاں بازار لگتا تھا)۔

خانہ کعبہ کا محلِ وقوع اور ہیئت

اس مقدس شہر کی آبادی سروات کی تسلسلی پہاڑیوں پر ہے جہاں چاروں طرف پہاڑ میں جو تہامہ کی وادیوں کا سنگم ہیں اور ہر چہار سمت سے آ کر یہاں مل جاتے ہیں۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی 280 میٹر ہے۔ مدینہ منورہ سے اس کا فاصلہ 430 کلومیٹر اور جدہ سے 73 کلومیٹر ہے۔

وادیٔ ابراہیم کے عین وسط میں واقع مسجد حرام میں خانہ کعبہ تعمیر کیا گیا ہے۔ اس مبارک گھر کی بلندی 14 میٹر ہے جبکہ اس کی بنیاد کی پیمائش 145 میٹر ہے۔ اس کی شکل چوطرفہ ہے مگر چاروں دیواریں یکساں نہیں بلکہ فرق ہیں۔ اس کی دروازے والی دیوار کا عرض 68ء 11 میٹر ہے۔ رکن شامی رکن یمانی والی دیوار کا عرض 4ء12 میٹر ہے۔ رکن یمانی اور حجرہ اسود والی دیوار کا عرض 8ء10 میٹر ہے اور حطیم کی سمت والی دیوار 90ء9 میٹر ہے خانہ کعبہ کے شمال میں ایک سائبان ہے روایات سے پتہ چلتا ہے اس جگہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانے میں ان کی بکریاں ہوتی تھیں۔ اس جگہ کو حطیم کہتے ہیں۔

روایت ہے کہ حجرِ اسود جبرائیل علیہ السلام آسمان سے لائے تھے جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نصب کیا جہاں یہ آجکل ہے بعض تاریخی مراجع سے پتہ چلتا ہے کہ اس مبارک گھر کو سب سے پہلے ملائکہ نے تعمیر کیا۔ یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ زمین کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے اس گھر کو اللہ تعالیٰ نے وجود بخشا پھر اس خانہ کعبہ کے نیچے سے ساری زمین کو پھیلا دیا۔ روایات کے مطابق اس کی متعدد بار تعمیر ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے۔ انہوں نے حرم کی حدود بنائیں، ان پر علامتیں نصب کیں فتح مکہ کے بعد حضور اکرمؐ نے تمیم بن اسید خزاعی کو بھیجا، انہوں نے حدود کی تجدید کا کام سرانجام دیا۔ اس کے بعد مسلم خلفاء اور امراحسبِ حاجت علامتوں کی تجدید کا کام کراتے رہے۔

مکہ کا موسم

مکہ مکرمہ سردیوں میں ذرا ہلکا گرم، گرمیوں میں سخت گرم ہوتا ہے۔ درجہ حرارت 48 ڈگری تک پہنچ جاتا ہے، ہوا کی رفتار نسبتاً کم ہوتی ہے کیونکہ سروات کی پہاڑیوں نے اسے اپنی آغوش میں لیا ہوا ہے۔ مکہ مکرمہ میں بارشیں کم ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسی موسلا دھار ہوتی ہیں کہ سیلابی کیفیت اختیار کر جاتی ہیں پہاڑوں سے پانی بہہ کر نیچے آ جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں سیلاب آیا تھا تو مقام ابراہیمؑ اپنی جگہ سے سرک گیا تھا اس کے بعد رکاوٹ کے طور پر دیوار بنوائی جس کو سدروم کہا جاتا ہے۔ پھر عمر بن خطابؓ نے اس کو اس کی سابقہ جگہ تعمیر کروایا پھر 202ھ میں ابن حنظلہ نامی سیلاب کا ریلہ آیا جس سے مسجدِ حرام پانی سے بھر گئی، مطاف میں لگی قندیلوں تک پانی چڑھ گیا۔ خانہ کعبہ کی بنیادوں کو خطرہ ہوا تو ترکی حکمران مراد عثمانی نے اسے دوبارہ تعمیر کروایا، پھر 1375ء میں فرمانروا شاہ سعود بن عبدالعزیز نے حرم کی توسیع کا حکم جاری کیا جو اب تک جاری و ساری ہے۔

مقدس مقامات

مکہ مکرمہ مسجدوں کا شہر بھی ہے۔ مسجدِ خیف، مشعرالحرام، مزدلفہ کی مسجد، مسجدِ نمرہ، مسجد جن، مسجد بیعہ، مسجد جعرانہ یہاں ہیں۔ دیگر معروف مقامات، غارِ ثور، غار حرا، منیٰ مزدلفہ، عرفات، وادی محسر وغیرہ ہیں۔ وادیٔ عرفہ میں حضور اکرمؐ نے حجۃ الوداع کا خطبہ دیا تھا اور ظہر و عصر کی نمازیں عصر کے ساتھ پڑھوائیں۔

تولیت کعبہ

طویل عرصے تک خانہ کعبہ کی ذمہ داری حضرت اسماعیل علیہ السلام پھر ان کے پوتے مضاض بن جرہمی، یعنی جرہم قبیلے کے ذمہ رہی۔ تیسری صدی عیسوی میں ایسی نسل تیار ہو گئی جس نے بیت اللہ کے تقدس کو پامال کرنے کی کوشش کی۔ ان پر اللہ تعالیٰ نے یمنی قبیلے خزاعہ کو مسلط کر دیا جنہوں نے دین ابراہیمی کو مسخ کرنے کی کوشش کی۔ کافی عرصہ خزاعہ قبیلے کی حکمرانی کے بعد ہوتے ہوتے خلیل بن حبشہ خزاعی نے اپنے داماد قصی بن کلاب قریشی کو ذمہ داری سونپی جو کہ حضور اکرمؐ کے چوتھے جد امجد تھے۔

انہوں نے یہ ذمہ داری خوب نبھائی اور باہمی مشورہ سے دارالندوہ قائم کیا، مختلف عہدے قائم کئے جن پر قریش کے اہم لوگوں کو فائز کیا۔ اس طرح سے اتحاد و اتفاق کی فضا قائم ہوئی۔ مطاف کی جگہ چھوڑ کر خانہ

کعبہ میں تعمیر کی اجازت دی۔ جب خوشحالی آئی تو عرب قبائل بکثرت حج اور تجارت کے لئے آنا شروع ہوئے۔

اسی طرح چلتے چلتے مکہ مکرمہ کی ولدیت اور ذمہ داری حضور اکرمؐ کے دادا حضر عبدالمطلب تک پہنچی۔ انہوں نے سب قبائل کو جمع کر کے معاہدہ کیا جو حلف الفضول کے نام سے معروف ہے جس کا کام مظلوموں کی دادرسی، بے کسوں کی محبت اور انصاف مہیا کرنا تھا۔ زمزم کا کنواں دوبارہ کھدوایا۔ جرہم قبیلہ جب وہاں سے نکلا تو اس نے زم زم کے چشمہ کو دفن کر دیا تھا تا کہ ربیعہ بن حارث اس سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ اس کے بعد عمر بن لحجی اور پھر خلیل بن حبشہ اور قصی بن کلاب کے ہاتھ خانہ کعبہ کی تولیت منتقل ہوئی۔ حضرت عبدالمطلب کے زمانہ میں دو اہم واقعات ہوئے، حاکم حبشہ ابرہہ کی ہلاکت اور حضورِ اکرمؐ کی ولادت باسعادت۔

حضور اکرمؐ کے بعد مکہ میں تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں۔ بت پرستی سے منع کرنے پر آپ کی شدید مخالفت، پھر شعب ابی طالب کے واقعے کی سختیاں اور پریشانیاں، پھر دو مضبوط سہاروں حضرت ابوطالبؓ اور حضرت خدیجہؓ کا داغِ مفارقت دے جانا سفرِ طائف اور ہجرت مدینہ جہاں سے اسلام کا آغاز ہوا۔ نبوی دور میں آپ نے مکہ کی ولدیت عتاب بن اسید صحابی کے سپرد کی۔ خود جنگ حنین پر روانہ ہوئے۔

تاریخ کے سفر میں مکہ پر بہت سے عہد گزرے۔ عہد راشدی عہد بنو امیہ، عہد عباسی، عہد ممالیک، عثمانی دور حکومت وغیرہ۔ مختلف ادوار سے گذرتے ہوئے 1924 میں حرمین شریفین کی خدمت وسعادت کا شرف سعودی حکومت کو حاصل ہوا۔ پندرہویں صدی کے پہلے دس سالوں میں مکہ مکرمہ کی تاریخ نے نئی کروٹ لی۔ حرم مکی کی عظیم الشان توسیع اور اس کے آس پاس کے علاقے کی ازسرنو تعمیر شروع ہوئی بڑے بڑے تجارتی مراکز، ہوٹل، رہائش گاہیں تعمیر ہوئیں تا کہ لاکھوں زائرین جو ہر سال یہاں آتے ہیں ان کو اعلیٰ ترین خدمات مہیا کی جاسکیں۔ ابھی تک بے مثال ترقیاتی کام ہو رہا ہے۔

غلاف کعبہ

حضرت اسماعیلؑ کے زمانے میں خانہ کعبہ پر فارسی پردہ تھا۔ حضور اکرمؐ کے زمانے میں یمن کے ریشمی کپڑے سے غلاف تیار کرایا گیا۔ پھر یمن کے بادشاہ نے سب سے پہلا غلاف تیار کروایا، شروع میں پرانے غلاف کے اوپر ہی غلاف چڑھاتے تھے مگر خلیفہ مہدی عباسی نے 160ھ میں حج کیا تو خانہ کعبہ کے محافظوں سے مشورے کے بعد تجویز کیا کہ ایک وقت میں ایک ہی غلاف ہو۔ اس کے بعد سے ہی روایت چلی آرہی ہے۔ جس کارخانے میں ریشم کا غلاف بنایا جاتا ہے وہ مکہ ہی میں قائم ہے۔ اس ریشم کو سیاہ رنگ دیا جاتا ہے۔ سنہری پٹی جس پر قرآنی آیات کشیدہ ہیں۔ 99 فیصد چاندی اور ایک فیصد سونے سے بنی ہے۔ پورا غلاف سولہ ٹکڑوں سے بنا ہے اور ہر سال 8 ذوالحجہ کو تبدیل کیا جاتا ہے۔

خانہ کعبہ کو سال میں دو مرتبہ غسل دیا جاتا ہے۔ خانہ کعبہ کی چابی کی لمبائی 40 سینٹی میٹر ہے۔ جس تھیلے میں رکھی جاتی ہے وہ بھی سونے کے تاروں سے بنا ہوا ہے اور اسی کارخانے میں تیار ہوتا ہے جہاں غلاف کعبہ تیار کیا جاتا ہے۔ فتح مکہ کے بعد آپ نے عثمانؓ بن طلحہ کو طلب کیا اور چابی طلب کی پھر حضرت عباسؓ نے حضور سے چابی طلب کی کہا کہ وہ یہ ذمہ داری لے لیں مگر اللہ تعالیٰ کی اس آیت کے مسابق **ان اللہ یامرکم ان تودو الامانات الیٰ اھلھا** آپ نے چابی عثمانؓ بن طلحہ کو دی اور کہا، اب یہ چابی تم سے کوئی نہیں چھینے گا سوائے ظالم کے۔ ان کے بعد یہ چابی ان کے چچازاد کو منتقل ہوئی۔

حجر اسود اور مقام ابراہیم

ابن عمر سے مروی ہے کہ رکن یمانی اور حجر اسود دو رکن ہیں جن کو استلام کرتے انہوں نے آنحضورؐ کو دیکھا ہے بلاشبہ ان کو چھونے سے خطائیں معاف ہوتی ہیں۔ مقام ابراہیم جنت کا پتھر ہے جس کو جبرائیل علیہ السلام جنت سے لائے۔ کعبہ کی تعمیر کے بعد آپ اس پر کھڑے ہوئے اور لوگوں کو حج کے لئے پکارا۔ 18ھ میں شدید سیلاب کے بعد یہ اپنی جگہ سے سرک کر سفلہ تک چلا گیا تھا۔ تب عمر بن خطاب نے اس کو اس کی سابقہ جگہ نصب کروایا۔ اس کی اہمیت اور فضیلت قرآن کریم اور احادیث سے ملتی ہے۔ (سورۂ بقرہ 125 آیت، مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالو) حضرت ابن عمر نے فرمایا حجر اسود اور مقام ابراہیم جنت کے یاقوتوں میں سے دو یاقوت ہیں اگر اللہ تعالیٰ ان کے نور ختم نہ کرتے

تو دونوں مشرق اور مغرب کے درمیان سب کچھ روشن کر دیتے۔

میزاب یعنی پرنالہ

یہ پرنالہ حطیم کی جانب چھت پر لگا ہوا ہے۔ کعبہ کی چھت کی ڈھلائی اور بارش کے پانی کے لئے لگایا گیا ہے۔ جب قریش نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی تو اس وقت یہ پرنالہ لگا تھا خانہ کعبہ کی چھت بھی اس وقت ڈالی گئی جو اس سے پہلے نہ تھی، اس پرنالہ کی لمبائی دو میٹر ہے۔ آخری دفعہ شاہ فہد نے لگوایا اور یہ بھی خالص سونے کا ہے۔

کعبہ شریف کے اندر کا فرش

کعبہ شریف کے اندر کا فرش سنگ مرمر کا ہے۔ ارد گرد کالے پتھر کی دھاریاں ہیں۔ کعبہ شریف کے اندر تین ستون ہیں جو لکڑی کے ہیں۔ ان پر چھت کا بوجھ ہے۔ ان کی لمبائی 9 میٹر اور قطر 44 سینٹی میٹر ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی جو ستون ہے اس کے بالکل سامنے کعبہ شریف کی دیوار ہے۔ اس پر گہرے سبز رنگ کی ٹائلیں لگا دی گئی ہیں جو اس چیز کی نشاندہی کرتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں نماز پڑھائی۔ دائیں طرف سیڑھیاں ہیں جو چھت کی جانب جاتی ہیں۔ یہ مضبوط قسم کے شیشے سے بنی ہوئی ہیں اس کی تعداد 50 کے قریب ہے۔ اس قرینے کا دروازہ باب التوبہ کے نام سے مشہور ہے۔

نہریں اور سرنگیں

حجاج کرام کی سہولت کے لئے مکہ المکرمہ میں سرنگیں بھی زبردست بنائی گئی ہیں جو کہ معیار کے اعتبار سے کسی طور بھی دنیا کی سرنگوں سے کم نہیں۔ کل 60 سرنگیں ہیں جن میں سے دس صرف پیدل چلنے والے کے لئے ہیں۔ ان سرنگوں کے بننے سے فاصلے سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ وادی نعمان سے نہر زبیدہ نکلتی ہے جو خلیفہ ہارون رشید کی ملکہ زبیدہ نے بنوائی تھی۔ بارہ سو سال تک اسی نہر سے مکہ معظّمہ میں رہنے والوں کی پانی کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔

حج انتظامات

مکہ مکرمہ میں خصوصی طور پر حج اور رمضان کے دنوں میں طبی سہولتوں کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔ ہسپتالوں کی بہت بڑی تعداد منیٰ اور عرفات میں ہے۔ فرسٹ ایڈ کے بے شمار سنٹر خاص طور پر جمرات کے پل پر تو طبی متحرک ٹیم ہمہ وقت متحرک و مستعد رہتی ہے۔ پارکوں کی بھی یہاں سہولیات ہیں جہاں کھیل کود کے آلات نصیب ہیں۔ تجارتی سرگرمیاں مکہ میں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ یہاں پر خانہ کعبہ کا وجود ہے جس کے ساتھ ساتھ تمام عالم اسلام کے مسلمانوں کا دل اور جذباتی تعلق ہے عہد نبوی میں بھی تجارتی سرگرمیاں بہت فروغ پر رہیں پھر اسلامی فتوحات سے یہ دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ لوگ اسلام میں فوج در فوج داخل ہونے لگے، سعودی دور میں امن و امان قائم ہوا۔ نقل و حرکت اور آمد و رفت کے ذرائع کو ترقی دینے میں بھی سعودی حکومت پیچھے نہیں رہی۔ چمڑے کی دباغت سے اسے قابل استعمال بنانا، اس سے جوتے، بیگ، لگام ہودج وغیرہ تیار کئے جاتے ہیں۔ ٹیکس ختم کر دیئے گئے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے پٹرول کی نعمت ظاہر کی تو صنعت و حرفت کے بھی وارے نیارے ہو گئے۔

مکہ کی فضیلت

کوئی شہر ایسا نہ ہوگا جہاں دجال نہ پہنچے گا سوائے مکہ اور مدینہ کے۔ اس کے راستے پر فرشتے صف بہ صف کھڑے ہونگے جو دجال سے حفاظت کریں گے۔

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں جو شخص طواف کے لئے ایک قدم اٹھاتا اور رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے بدلے ایک گناہ معاف کر دیتے ہیں۔ اور اس کے بدلے میں ایک نیکی لکھ دیتے ہیں انہی سے مروی ہے جس شخص نے اس گھر کے ساتھ چکر لگا کر طواف کیا اس کو ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب ملے گا۔

حضور اکرمؐ نے فرمایا:

''بلا شبہ اسلام غربت کی حالت میں تھا، غربت کی حالت میں لوٹ آئے گا جیسا کہ شروع میں تھا۔ ایمان دونوں مسجدوں کے درمیان سمٹ آئے گا جیسے سانپ اپنے بل میں واپس آجاتا ہے۔''

حضرت امام نووی فرماتے ہیں کہ یہاں دونوں مسجدوں سے مراد مسجد حرام اور مسجد نبوی ہیں۔

☆.....☆.....☆

قربِ قرآن ہو عطا مولا!

قربِ قرآن ہو عطا مولا
علم و عرفان ہو عطا مولا

حرفِ قرآن پڑھ لئے میں نے
فہم قرآن ہو عطا مولا

نقش باطل مٹاسکوں ہر جا
ایسا ایمان ہو عطا مولا

میرے پہلوں نے جیسی پائی شان
پھر وہی شان ہو عطا مولا

قاریوں، حافظوں کی کثرت ہے
اہلِ قرآن ہو عطا مولا

پرکھیں اعمال اسی کسوٹی پر
دل پہ فرقان ہو عطا مولا

ہم امامت اسی سے پائیں گے
سچا ایقان ہو عطا مولا

راہ دکھلا دے بھٹکی امّت کو
تیرا احسان ہو عطا مولا

مصحفِ پاک کی محبت سے
حبّ رحمان ہو عطا مولا

روبینہ فرید

نعت شریف

نام خیرالوریٰؐ ہر درد کا درماں ٹھہرا
شاہؐ کا نقشِ کفِ پا مرا ایماں ٹھہرا

زلف واللیل جبیں مہر درخشاں ٹھہری
مصحفِ نور نبیؐ صبح کا عنوان ٹھہرا

آپؐ کو رحمت و نعمت کیا انسانوں پر
عالم زیست پہ اللہ کا یہ احساں ٹھہرا

جس نے احکام خداوند سے کی سر تابی
عرش پہ ہو کے فرشتہ بھی وہ شیطاں ٹھہرا

جن مقامات پر جبریل کے پر جلتے ہیں
ان مقامات پہ جو پہنچا وہ انساں ٹھہرا

ذکرِ احمدؐ کا ہے یہ فیض کہ ہر گلشن میں
یاسمیںؔ تیرا ہر اک غنچہ گلستاں ٹھہرا

نجمہ یاسمین یوسف

غزل

ہر حقیقت سے ہے بڑھ کر مرا افسانۂ غم
کیسے سمجھے گا مرا غم کوئی بیگانۂ غم

میں کہ شیدائی چشمِ مئے افرنگِ بتاں
کوئی تو ہو جو بھرے میرا یہ پیمانۂ غم

میں نے دیکھا ہے جہاں میں عجب اک رنگ جہاں
کوئی فرزانۂ راحت کوئی دیوانۂ غم

ہر طرف بادِ بہاری نے مچائیں دھومیں
دیکھئے معجزہ خاکستر پروانۂ غم

سارے عالم میں نہیں کوئی بھی سودائِ درد
کون آباد کرے گا مرا کاشانۂ غم

کوئی خوشیوں کی تمنا نہ دکھوں کی پروا
کتنا بیگانۂ عالم ہے یہ مستانۂ غم

کتنے فرہاد سے مجنوں سے ہیں آباد یہاں
کوئی آکرذرا دیکھے مرا ویرانۂ غم

میرے جانے سے ذرا دیکھئے کیا رنگ ہوا
اب کوئی شمع ہے محفل میں نہ پروانۂ غم

میں ہی جب ذکر مے و بادہ پہ ہوں برگشتہ
کیسے آباد رہے گا مرا میخانۂ غم

میں اسے خود ہی سناؤں گا خود ہی سن لوں گا
میرا افسانۂ غم ہے مرا افسانۂ غم

اپنی ہستی ہی مٹا ڈالی حبیبؔ اس کے لئے
پھر نہ کیوں پھولے پھلے میرا ہر اک دانۂ غم

حبیب الرحمن

صبیحہ نبوت

یہ ساٹھ سال

اگر ایک سال پر نظر ڈالیں تو لگتا ہے یہ عرصہ بہت طویل ہے کیسے گذرے گا یوں لگتا ہے جیسے پہاڑوں کا طویل سلسلہ ہو۔ وسیع سمندر ہے۔ گھنا جنگل ہے۔ جہاں خوشیاں بھی طویل ہیں اور غم بھی بے کراں، جو گذرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ خراماں خراماں چلے جا رہے ہیں۔ لیکن نہیں ..... ہیں تو صرف بارہ مہینے ..... گزر ہی جائیں گے۔ ان کا گزرنا کون سا مشکل ہے چٹکی بجائی اور یہ گزر گئے۔

ایک وہ وقت تھا جب ہم نے آنکھ کھولی تھی اذان کی آواز کانوں میں آئی تھی۔ ماں نے محبت بھری نگاہ ڈالی تھی۔ لیکن سوچا تھا یہ ننھی سی جان کب بڑی ہوگی بہت وقت لگے گا کتنی محنت کرنی پڑے گی۔ مستقبل کے خواب سجائے تھے۔ پرورش کے معیار مقرر کئے تھے نیک اور صالح بننے کی دعائیں کی تھیں۔ لیکن دیکھو وقت کیسا پر لگا کر اڑا۔ ننھی سی جان نے کروٹ بدلی۔ وقت کے ساتھ اس کا قہقہے لگانا۔ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، پڑھنا لکھنا، زندگی کی ہر دوڑ میں حصہ لینا..... کبھی کامیابی اور کبھی ناکامی..... اسی میں بے شمار سال گذر گئے۔ ابھی تو سالگرہ ہوئی تھی۔ کتنی جلدی سال گذر گیا۔ لیکن جب بارہ مہینوں پر غور کیا تو وقت پھر سے تھم گیا۔ یوں لگا جیسے وقت گزرنا ہی نہیں چاہتا۔

پھر بارہ مہینوں نے تو سب کچھ بدل دیا۔ ماحول بدل گیا۔ معاشرہ بدل گیا۔ موسم بدل گیا۔ حالات بدل گئے، روایات بدل گئیں، ملک بدل گئے، شہر بدل گئے۔ کچھ بھی تو وہ نہیں رہا، جو ایک سال پہلے تھا، ان بارہ مہینوں کے لئے نہ جانے کتنے پروگرام بنائے تھے، بہت کچھ کرنا تھا، بہت کچھ چاہا تھا۔ بہت کچھ سوچا تھا۔ ذرا سوچو یہ بارہ مہینے یوں ہی تو نہیں گذرتے ہیں۔ انسان کا سب کچھ لے بھی جاتے ہیں، اس کا بچپن اس کی جوانی اس کی صحت اس کی طاقت اس کی ہمت کچھ بھی تو نہیں رہا کہنے کو ایک سال ہی تو تھا..... لیکن ان بارہ مہینوں میں کیا کچھ نہیں ہوا بسوں کے حادثے، بم دھماکے، قتل و غارت گری، سیاست، دھرنے، لعن طعن، الزامات اور بھی بہت کچھ۔

ایسے ہی سالوں میں ایک ہجرت کا سال بھی تھا۔ جب پاکستان بنا تھا۔ لوگوں نے سب چھوڑ چھاڑ کر نئے وطن کو ترجیح دی تھی۔ میں اس وقت بچہ تھا۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ کچھ یاد نہ ہو۔ پاکستان بننے کے لئے جب لوگ نعرے لگاتے تھے کہ ''بٹ کے رہے گا ہندوستان بن کے رہے گا پاکستان'' اس وقت ہم بچے سب سے آگے ہو کے اور خوب جوش میں آگے آگے بھاگتے۔

ہمارے بڑوں نے بھی پاکستان کو اپنا مسکن بنایا۔ جب زندگی مشکلات سے دوچار ہوئی وقت تھم سا گیا اس وقت اپنا گھر یاد آیا..... وہ گھر بہت بڑا تھا۔ اس میں چھ خاندان آباد تھے۔ سب کی خوشیاں اور غم ایک تھے، سب کے بچے ایک تھے، سب مل جل کر رہتے تھے۔ ان میں محبت تھی خلوص تھا سادگی تھی۔ وہ گھر میری یادوں کا مسکن تھا۔ جب اسکی یاد آتی تو سال بھی طویل ہو جاتا اور بارہ مہینے بھی ٹھہر جاتے۔ یہاں آزاد وطن کی خوشی تو تھی۔ لیکن سال اور مہینوں کی طوالت نے شاید اس کو معدوم کر دیا تھا۔ اس گھر کا باغ یاد آتا جہاں لونگ اور الائچی کے درختوں کے علاوہ بے شمار پھل دار درخت تھے۔ تالاب تھا جس میں سنگھاڑے لگتے تھے اور بہت بڑا میدان جہاں ہم سب بچے مل کر کھیلا کرتے تھے۔ اس میں مسجد بھی تھی جہاں سے پانچوں اذانیں سنتے نمازیں پڑھتے، اس وقت میں دوسری جماعت میں تھا لیکن یہاں میں نے پوری زندگی گزار دی بلکہ ساٹھ سال۔ بچے بھی بڑے ہو گئے۔ حالات بھی اچھے

تھے، سکون بھی تھا، اطمینان تھا لیکن بے شمار سال اور مہینے گذرنے کے باوجود وہ گھر میرے حواس پر سوار تھا۔ میرا دل چاہا میں اسے ایک دفعہ دیکھ لوں۔

اس خواہش کو پورا کرنے میں وہاں گیا..... وہ مسجد وہ میدان وہ باغ لیکن جب میں وہاں گیا تو وہاں کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ وہ گھر بے شمار حصوں میں بٹ چکا تھا۔ نہ میدان تھا نہ باغ، ہاں مسجد آثار قدیمہ کا نمونہ ضرور تھی۔ وہاں طرح طرح کے لوگ آباد تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کیا یہ وہی گھر ہے جس میں بہت سے خاندان آباد تھے۔ یہاں باغ میں لونگ الائچی کے درخت تھے۔ سب حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے اور میں اپنی حماقت پر نادم تھا کہ میں وہاں کیوں گیا۔ ظاہر ہے ساٹھ سال میں تو دنیا بدل ہی جاتی ہے میں بہت دن تک پچھتاتا رہا۔ اپنے وطن آکر میں نے شکر کیا اور عہد کیا کہ اسی کے لئے مرنا اور جینا ہے اسی کے لئے تو ہم نے قربانی دی تھی۔

یہ سب سوچتے سوچتے میں نیند کی آغوش میں چلا گیا اور نہ جانے کیا کیا خواب میں دیکھا تھا۔ صبح میرا دماغ بڑا بوجھل تھا۔ میں رات بھر اسی گھر میں دوڑتا بھاگتا رہا۔ وہی باغ وہی تالاب، وہی میدان، میرے ذہن پر یوں سوار تھے میں نے خیالات کو جھٹکا۔

اب تو اتنے سال اور نہ جانے کتنے مہینے گذر چکے ہیں لیکن یہ خواب کیوں؟ کہنے کو سال ہی تو ہے، یعنی صرف بارہ مہینے جو پلک جھپکنے میں گذر جاتے ہیں ساٹھ سال بعد بھی لگتا ہے ابھی تو نیا سال آیا تھا!!

☆.....☆.....☆

بازگشت

صالحہ کی آنکھوں میں مرچیں بھری ہوئی تھیں۔ دکھ کی شدت سے نمکین آنسو نکلتے اور سارا چہرہ بھیگ جاتا۔ چہرہ پر جلن ہی جلن، ذہن میں سوال کانٹے کی طرح چبھتا۔

وہ کلپی۔ ہائے میرے خدا میرے ساتھ ایسے کیوں ہوا؟ کہاں کمی رہ گئی؟ میں نے تو بچوں کو کھلانے پلانے سے لے کر زندگی کے ہر معاملے اور ہر مرحلے پر سہولت ہی دی۔ خود ذہنی اور جسمانی مشقتیں برداشت کیں، گھرداری، ملازمت، بن باپ کے بچوں کو زندگی کی ایک سانس میں بھی باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ یوٹیلیٹی بلز جمع کروانے سے، سودا سلف، بچوں کی تعلیم، ہر کام کا بوجھ اپنے نازک کندھوں پر اٹھایا۔ مبادا بچوں کے منہ سے ایک کلمہ ایسا نہ نکلے کہ وہ احساس محرومی کا شکار ہو جائیں۔ بچوں کے لئے بہترین ادارے، اکیڈیمیز، برانڈڈ کپڑے..... ہر چیز پہلی فرمائش پر حاضر کر دیتی تھی..... کہ بچے یہ نہ کہہ دیں کہ آپ کو ہمارا تو خیال ہی نہیں! پھر..... پھر..... ہائے اللہ! پھر ہادیہ نے یہ منہ پھاڑ کے کیوں کہا..... آپ کو تو پین کلر لینے کا شوق ہے۔ تھوڑا سا درد ہوتا ہے اور بیٹا پینا ڈول تو دینا، کا نعرہ لگاتی ہیں۔

اُف! تیز برچھی سینے پر لگے تو ایسے تکلیف نہ ہو جتنی اس ایک فقرے سے ہو رہی ہے۔ کسی کو کہہ سن کر بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتی تو سننے والے نے آرام سے یہی کہنا تھا۔

اتنی سی بات پر اتنا ردعمل؟ تو کیا ہوا۔ بچے ہیں، ایسے کہہ ہی دیتے ہیں۔ یا پھر یہ کہہ دیں گے۔ ہاں تو آج کل کی اولاد ایسی ہی ہے۔ منہ پھٹ، بدتمیز، چھوٹے کا لحاظ نہ بڑوں کا ادب احترام، کلجگ ہے بھئی کلجگ!

تو کیا ہوتا..... دکھ کا بوجھ دگنا ہو جاتا۔ سو کسی سے بھی کہنے سننے کی بجائے وہ خود ہی سلگتی رہی۔ ''آپ کو تو شوق ہے پین کلر لینے کا۔'' حرفوں سے مل کر بنے لفظ اور لفظوں سے ترتیب دیا۔ حملہ نہیں، گھونسا تھا جو اس کے دل پر لگا تھا۔ ہتھیلی کے چھالے کی طرح پالی اولاد..... اور ماں کا بس اتنا سا احساس؟

صالحہ، منہ پر ہاتھ رکھ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگیں۔

میں اپنا درد کسے دکھاؤں! کاش دنیا میں کوئی ایسی مشین ایجاد ہوتی جو اس کے گھٹنوں اور ٹانگوں کا درد ناپ تول کر دکھا سکتی۔ اس کا دل نئے سرے سے پھوڑا بن کے پھس گیا۔ وہ پھر رونے لگی۔ اب تو کئی مہینوں سے اس درد کے ہاتھوں وہ اتنی لاچار ہو گئی تھی کہ تھوڑا سا کام کرتی اور تھک جاتی۔ ساری پھرتیاں قصۂ پارینہ بن گئی تھیں اب تو وہ درد کی پوٹ تھی۔ کبھی بازو میں کبھی گھٹنوں اور ٹانگ میں۔ تھک کر دم لینے کو بیٹھتی تو عجیب عجیب سوچیں دماغ پر حملہ کرتیں۔ کاش اے کاش اس کے لئے کوئی واکر ہو جس میں بیٹھ کر جہاں چاہے وہ سکینڈ میں پہنچ جائے۔ یہ پاؤں چلنے کے قابل ہی کہاں رہے ہیں اب۔ وہ سوجے ہوئے پاؤں کو دیکھ کر آہ بھرتی۔ کبھی دل چاہتا بچوں کی طرح آرام سے کسی جھولے میں لیٹ جائے..... آنکھیں بند کر لے اور جھلانے والے ہاتھ جھولا جھلاتے جائیں۔ کتنا آرام ہوگا بچوں کو جب وہ جھولے یا پنگھوڑے میں لیٹ کر جھولتے ہوں گے۔

آج بھی درد سے بے حال ہو کر انہوں نے چائے کے ساتھ پین کلر کی فرمائش کی تھی جس پر سگی بیٹی، اکلوتی بیٹی، نازوں سے پلی شہزادی نے نشانہ تاک کر لگایا۔

''امی آپ کو تو شوق ہے پین کلر لینے کا۔''

روتے روتے وہ بے دم سی ہوئیں۔ پاس پڑے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلا لحظہ بھر کے لئے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔

''ارے یہ فقرہ اتنا سنا سنا سا کیوں ہے؟''

''اوہ۔انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

یہ فقرہ.....اُف اللہ آج سے صرف چوبیس سال پہلے یہ فقرہ.....

امی آپ درد کے شروع میں ہی کیوں گولی لے لیتی ہیں تھوڑا سا برداشت تو کر لیا کریں۔انہوں نے ہی تو کہا تھا۔بس لہجہ تلخ اور بیزار تھا۔ کس سے کہا تھا؟ اپنی ماں سے! آج.....آج یہ فقرہ اس سے سنگین لفظوں اور کڑواہٹ بھرے لہجے کے ساتھ پلٹ کر ان کے کانوں تک آ پہنچا۔ان کے سارے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ان کے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔تم کہتے ہو بیماریاں ورثے میں ملتی ہیں، برائیاں بھی ملتی ہیں! یہ بھلا کس نے کہا تھا؟ ہاں یاد آیا کیمیائے سعادت یہی کتاب کا نام تھا۔

امام غزالی کے بارے میں لکھا تھا کہ ان کے والدین نے پہلے حمل کا پتہ چلنے کے بعد یہ سوچا تھا کہ آیا بیماریوں کی طرح برائیاں بھی اگلی نسل میں منتقل ہوتی ہیں یا نہیں۔انہوں نے طے کیا تھا کہ حمل کے نو ماہ میں وہ خدا کو ناراض کرنے والا کوئی عمل نہ کریں گے۔پھر واقعی نو ماہ ان کے ایسے ہی گزرے۔امام غزالی کی والدہ با آواز بلند تلاوت قرآن میں مصروف رہتیں۔دونوں میاں بیوی آنے والے بچے کی خاطر ہر گناہ سے کروڑوں میل دور رہتے۔بچہ پیدا ہوا۔گود سے نکل کر پاؤں پاؤں چلنے تک پہنچا اور پھر باپ کی انگلی پکڑ کر مسجد بازار جانے لگا۔بچہ ویسا ہی تھا جیسا دونوں میاں بیوی نے چاہا۔تابعدار، فرمانبردار، آنکھوں کی ٹھنڈک۔

لیکن سب کچھ ویسے نہیں ہوتا جیسے چاہا جاتا ہے۔ایک روز امام غزالی کے والد نے بچے کی انگلی پکڑی اور بازار چلے گئے۔راستے میں ایک ریڑھی پر بیر بک رہے تھے۔ ننھے غزالی نے ہاتھ بڑھا کر بغیر اجازت کے بیر اٹھا لیا۔والد کو پتہ چلا تو گھر آ کے صدمے کی حالت میں بیوی سے بولے۔

''نیک بخت میں نے تو اپنا جائزہ لے لیا ہے تم بتاؤ تم نے تو اس کی پیدائش سے پہلے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کے نتیجہ میں آج بچے نے بیر اٹھا لیا؟''

بیوی کچھ دیر سوچنے کے بعد شرمندگی سے بولی۔

''ہاں حمل کے عرصہ میں ایک دفعہ میرا دل بری طرح سے چاہا کہ کہیں سے کھانے کو بیر مل جائیں۔بھلے جائز ہو تقویٰ کی روح سے تو اچھا نہ تھا۔پھر بھی میں نے پڑوسیوں کے اس درخت سے جس کا بیر ہمارے صحن میں بھی گرتا تھا بغیر پوچھے اٹھا کے کھا لئے۔

امام غزالی کے باپ نے لمبی سرد آہ بھری۔اس کا مطلب ہے یہ نظریہ بالکل درست ہے کہ جس طرح بیماریاں بچوں میں ماں باپ سے منتقل ہوتی ہیں، برائیاں بھی منتقل ہوتی ہیں بلکہ سچ پوچھو تو اگلی نسل میں برائیاں کئی گنا زیادہ ہو کر منتقل ہوتی ہیں۔

یہ فقرہ انہوں نے جب اپنی پیاری ماں سے کہا تھا تو ان کے دل پر بھی ایسے ہی چھریاں چلی ہوں گی۔

ان کی آنکھوں کے کٹورے سے بھی پانی یوں ہی چھلکا ہوگا!

ان کے سینے پر بھی یہ فقرہ ایسے ہی گھونسا بن کر لگا ہوگا!!

ہائے امی جان! میں نے ایسے کیوں کہا آپ کو..... وہ رو رہی تھی۔لیکن آنسو پونچھنے سے پہلے پہلے اس نے ایک عزم کیا۔تلافی کی ایک صورت تو ہے ناں!

اپنی غلطی پر معافی مانگنے سے تسلی ہو نہ ہو۔وہ اپنی پیاری ماں کی مغفرت کے لئے ہر نماز کے بعد دعا کرے گی۔اور اپنی اولاد کے لئے ہدایت کی دعا۔بلاشبہ اس سے اچھی تلافی ہو ہی نہیں سکتی۔

☆.....☆.....☆

نادیہ سیف

خوابِ غربت

معاشرے کی چکی کو کھینچنے والے مزدور روزانہ منہ اندھیرے چورنگی کے دائرے میں آ سماتے ۔چھوٹے بڑے پیشہ ورانہ جتھوں کی صورت ہر ایک کے سامنے اسکے مخصوص اوزاروں کا ڈھیر ہوتا ۔سماجی مشین کے پرزے جن کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کس کی خدمت کر رہے ہیں ۔یکسر بے نیاز ہیں کہ بہرصورت ان کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔آپس میں مزدوری ملنے تک کبھی چائے کے ساتھ باتیں کرتے ،کوئی اخبار کی سرخی کان میں پڑ جاتی تو مایوس سیاسی تبصرے کرنے لگتے ،پھر کبھی جھینگروں کی طرح آپس میں ہی لڑنے لگتے ۔

جب کوئی کام لینے والا ادھر آ نکلتا تو جیسے سب میں اپنے ساتھ والوں پر سبقت لے جانے کی وقتی تحریک پیدا ہو جاتی ۔اور یوں ہر ایک کو کوئی نہ کوئی مزدوری مل جاتی اور وہ ایک طرف بیٹھے بوڑھے کی طرف دیکھتا اور مسکراتا ہوا چلا جاتا۔اس کے بعد مزدور کم ہوتے اور آخر میں صرف بوڑھا اکثر بیٹھا ہی رہ جاتا،جس کے گھٹنے پر اسکا سات سالہ پوتا زمانے سے بے خبر سو رہا ہوتا۔کچھ مزدور بڑے میاں کو مزدوری نہ ملنے پر،اسکا مذاق اڑاتے اور آنے والے اسکے بڑھاپے کو مایوسی سے دیکھ کر کام لینا پسند نہ کرتے ۔انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ جو اپنی منکسر مزاجی یا کمزوری کی وجہ سے چپ رہے اسے اور تختۂ مشق بنایا جاتا ہے ۔کچھ اور لوگ بھی غیر دانستہ محض دل بہلانے کی خاطر اس مذاق میں شریک ہو جاتے ۔لیکن بوڑھا مسکرا کر چپ ہو جاتا ۔اسکی آنکھیں ہمیشہ مطمئن اور مسرور نظر آتیں ۔

جانے وہ کونسی مصیبت تھی جس نے اسکا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔حالانکہ خستہ حال بڑھاپے کے باوجود اس کے چہرے پر اب بھی خوبصورتی کی چند علامات باقی تھیں ۔ لاغر وجود جس کی گردن اور چہرے پر گہری جھریاں تھیں ۔ہاتھوں پر وزن اٹھانے اور کھینچنے سے نمایاں گٹوں کے نشان تھے ۔مگر ان میں سے کوئی بھی تازہ نہ تھا۔کیونکہ آج اسے پورے تین دن ہو گئے اور کوئی چھوٹی موٹی مزدوری بھی نہ مل سکی تھی ۔

او! بڑے میاں کب تک ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہو گے ۔میں نے سنا ہے کہ فروقی (فاروقی) دور میں بوڑھے اور بچوں کو وظیفہ ملتا تھا۔لیکن اب تو شریفوں کا دور ہے تم کس انتظار میں بیٹھے ہو!

ہاہاہا.....سب مزدوروں نے مشترکہ قہقہہ لگایا۔ایک مزدور شیدا جس کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا اور شاید کوئی نشہ وغیرہ بھی کرتا تھا،مونچھوں کو مروڑتا اور شریف کے لفظ پر زور دیتا ہوا بولا ۔

اور جو جتنا شریف ہوتا ہے اسکا اتنا ہی فائدہ ہوتا ہے ۔میری مان تو اپنے پوتے کو میرے ساتھ بھیج دے .....تیرا بڑھاپا سنور جائے گا۔چھوٹا موٹا مال سپلائی اور..... پیسہ ہی پیسہ۔۔کبھی اندر گیا تو فکر کی بات ای نئیں۔۔اواپنے بڑے یار ہیں جو فور اً لے دے کر معاملہ کھلاس (ختم) کروا دیتے ہیں ۔وہ خالص غنڈوں کے انداز میں بہت دیر تک بوڑھے کی سمع خراشی کرتا رہا۔

بوڑھے کی طرح بچہ بھی پوری دیہاڑی جتنا کام کرنے کے قابل نہیں تھا۔جبکہ بوڑھا کل کے واقعے سے پریشان بھی تھا۔اور کچھ نیک دل مزدور بھی بچے کے غلط ہاتھ میں پڑ جانے کے خدشے سے فکر مند تھے ۔لہذا ایک مزدور نے سمجھایا کہ بچے کو ہر روز ہم میں سے کسی کے ساتھ آدھی دیہاڑی پر بھیج دیا جائے ۔ وہ کام پر ہو گا تو شیدے کو ورغلانے کا موقع نہیں ملے گا۔پھر اگلے دن بوڑھے نے اپنی دھوپ میں جلی ہوئی محبت بھری آنکھوں سے اپنے پرعزم پوتے کو جاتے ہوئے دیکھا اور آنسو صاف کرتے ہوئے سوچا اگر اسے زندگی کی تھوڑی سی بھی

آسائش ملتی تو اسکے پچکے ہوئے گالوں میں شاید چمک ہوتی۔ بیچارہ پانچ سال کی عمر سے اینٹیں ڈھو رہا ہے۔کاش واقعی کوئی ایسی حکومت آجائے جو جو مجھ بوڑھے اور یتیم پوتے کو پیٹ بھر روٹی دے دے یا کم از کم روزانہ مزدوری تو مل ہی جائے.....میں شاید اب محض نکما بوڑھا ہوں۔کبھی خود کو تسلی دیتا کہ امید اور اعتماد ختم نہیں ہوتے،، پھر مختلف پریشان باتوں کو جھٹک کر سوچتا،سوائے عمل کے باقی سب باتیں فضول ہیں۔وہ پوتے کے واپس آنے تک خود سے باتیں کرتا اور شرمندہ ہوتا رہا۔

اگلے دن آخری تین مزدوروں کو جب پورے دن کی مزدوری کا ٹھیکا ملا،تو کام زیادہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے بڑے میاں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ ٹرک جب زیرِتعمیر مکان کے سامنے رکا تو چاروں مزدور مختلف سامان ڈھونے لگے۔جن میں کچھ لکڑی کے بڑے بڑے جال بھی تھے۔جنھیں ٹرک سے اتارے بغیر سیدھا،رسیوں کی مدد سے چھت پر لے جانا تھا۔جال اوپر کھینچنے کے دوران بوڑھے کا دایاں ہاتھ لوہے کی گرل اور رسی کے درمیان اِس زور سے مسلا کہ کھال دب کر پھٹ گئی۔اس نے رِستا ہوا خون اپنے کپڑوں سے رگڑا،لیکن زخم ہاتھ کے کام والے حصے میں تھا۔جبکہ بایاں بازو پہلے ہی کام کے بوجھ سے اکڑ چکا تھا۔وہ جانتا تھا کہ دیہاڑی ختم ہونے تک اسے اپنے ہاتھوں سے کتنا کام لینا تھا.....اف یا اللہ میری مدد فرما۔۔اس اکڑن کو دور کر دے۔اس نے اپنے اینٹھے ہوئے بازو کو بند کھول کر کے نرم کرنے کی کوشش کی۔پھر خیال آیا ممکن ہے دھوپ لگنے کے ساتھ ساتھ کھل جائے۔یہ پٹھوں کا کھنچاؤ نہیں۔۔۔بدن کی دغابازی ہے۔

بڑے میاں.....کیا ہوا؟۔کوئی ہڈی ٹوٹ گئی کیا.....ایک مزدور نے ہنستے ہوئے دوسروں کی طرف آنکھ دباتے ہوئے کہا۔بوڑھے نے نہیں میں نے گردن ہلا کر سوچا،ہڈی ٹوٹنے کا درد نہیں معلوم،پر میری کمر واقعی تختہ ہو چکی ہے.....پھر خیال آیا،،درد تو آدمی کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتا،،اس نے مضبوطی سے سیمنٹ کی بوری کو اپنی پیٹھ پر سرکایا،اور وزن کو باری باری دونوں کندھوں کی طرف لڑھکاتا ہوا بوریوں کو انکے مقام پر پہنچاتا رہا۔اسکے بے حس ہاتھ،وجود کی پروا کئے بغیر،اپنی وفاداری کا ثبوت دیتے رہے۔دھوپ تیز ہوئی،پھر ڈھل بھی گئی،اور بوڑھا مشینی انداز میں کام کرتا رہا۔آخر اس کے دل میں بچگانہ خواہش جاگی۔۔کاش میں اس وقت سب چھوڑ کر سو سکوں اور کوئی اچھا سا خواب دیکھوں۔۔۔پھر وہ اپنی سوچ پر مسکرایا اور ایک دفعہ پھر سر جھٹک کر کام میں جت گیا۔

واپسی میں اسے پورے دن کی محنت،جب مزدوری کی صورت ملی،تو ہمیشہ کی طرح جیب میں رکھی اور چل دیا۔سڑک کو بغور دیکھتا اور سوچتا ہوا وہ گھر کی طرف خود کو گھسیٹنے لگا۔کسی پوشیدہ غم کے سبب،بوڑھا بولتی ہوئی ہڈیوں،اور بدن میں درد سے اٹھتی ہوئی ٹیسوں کو زیادہ ہی محسوس کر رہا تھا۔کیا میں آج ہار گیا؟لیکن مجھے کس نے ہرایا.....غربت نے.....بڑھاپے نے.....جوان بیٹے کی اچانک موت نے.....یا مارے ہوئے حق نے.....یا.....سوچ کے دھارے میں اسکے پوتے کا سراپا لہرایا تو وہ مسکرا دیا۔نہیں.....میں نہیں ہارا۔

جھونپڑی کے باہر پیوند لگا پردہ ساکت تھا۔بوڑھا اندر داخل ہوا،پانی پیا پھر اپنے کندھے والے رومال کو جھاڑ کر اِس میں اخبار کا بنڈل لپیٹا اور سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ادھڑی ہوئی رضائی اپنے کندھوں تک اوڑھ لی (بوسیدہ بستر پر دکھتا وجود)۔اب وہ پھر اچھا سا خواب دیکھنے کی خواہش کو سوچ رہا تھا۔

لڑکا کام سے واپس آیا تو بوڑھا بے خبر سو رہا تھا۔ہتھیلیاں کندھوں سے اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔وہ دادا میاں کے ہاتھ دیکھ کر رونے لگا۔پھر دادا کے لئے دودھ والی گرم چائے لینے گیا تو سارے راستے آنسو بہاتا رہا۔ اسے کوئی پروا نہیں تھی کہ کوئی اسے روتا ہوا دیکھ لے۔ بچے نے بوڑھے کو چائے کے لئے اٹھایا تو وہ اسے ایسے دیکھنے لگا جیسے بہت دور دراز سے آیا ہو،پھر پوتے کو غمگین دیکھ کر وہ اپنی ساری تکلیف بھول گیا۔چائے پی اور پوتے کو دیر تک پیار کرتا رہا۔

دادا میاں تم جلدی ٹھیک ہو جاؤ ہم ایک ساتھ مزدوری کریں گے۔میں تم سے ہلکا کام کرواؤں گا،بھاری کام میں خود کرونگا۔

اچھا..... بوڑھا مسکرایا۔ اگر تیرا باپ زندہ ہوتا تو وہ ہم دونوں کو ہی کام نہ کرنے دیتا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بچے کے سامنے اسکی آنکھ سے دو آنسو لڑھک آئے۔ جبکہ بچہ پہلے ہی بے آواز رو رہا تھا۔

دادا میاں تم آرام کرو، میں کھانا لاتا ہوں۔ دواؤں کی دکان سے تمہارے ہاتھوں کے لئے بھی کچھ لاؤں گا۔

بوڑھے نے بچے کا کہنا مان کر فوراً سر واپس بنڈل پر رکھ دیا اور اپنی نیند میں بھری ہوئی آنکھوں کو دوبارہ بند کر لیا۔ پوتا سر سہلاتا رہا تو بوڑھا غنودگی میں بولا۔

میری کدال کا دستہ بھی ہِل گیا ہے۔

میں سب کچھ ٹھیک کر دوں گا، تم سو جاؤ۔ یہ کہہ کر بچہ جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔

بوڑھا گہری نیند میں تھا۔ وہ خواب دیکھنے لگا کہ اس کے ہاتھ بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں، کدال کا دستہ بھی نیا ہے اور وہ مسکراتے ہوئے اپنے پوتے کے ساتھ روزانہ مزدوری پر جاتا ہے۔ اس کی خواہش پوری ہو گئی تھی..... اچھے سے خواب کی!

☆.....☆.....☆

وہ رو رہی تھی۔ جیسے جسم کا سارا خون آنسوؤں کی صورت بہا دینے کا ارادہ ہو۔ اور میں خاموش ٹھہری نگاہوں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

آسیہ عمران

چوڑیاں اور کنگن

کوئی دلاسہ، تسلی کا لفظ باوجود کوشش کے زبان سے نہیں نکل رہا تھا اس کے ٹوٹے پھوٹے بے ترتیب جملوں سے بمشکل واقعہ سمجھ آیا تھا۔

اس کا شوہر اس پر ناراض ہوا تھا اور گھر سے نکلتے کہہ گیا تھا ''میں تجھے طلاق دے دونگا۔'' وہ روتی جا رہی تھی یہ جملہ اسے کچوکے لگاتا تھا ''میں تجھے طلاق دے دونگا۔''

سوں سوں کرتی تھوڑی دیر بعد وہ ایک لمبی سسکاری بھرتی۔ میں نے تسلی دی، شربت پلایا۔ وہ شاید رو رو کر تھکی ہوئی تھی۔ وہیں صوفے پر ہی نیم دراز ہوگئی۔

☆.....☆.....☆

ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے برابر کے گھر کی بچی کے ساتھ وہ ہمارے گھر آئی تھی۔ اسے قریبی بی ایڈ کالج کے بارے میں معلومات چاہئیں تھیں۔ میں نے فطری تجسس کے تحت استفسار کیا تھا کہ ساتھ آنے والی بچی سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ اس کا جواب چونکا دینے والا تھا ''ماں'' اور میں نے بے یقینی سے کہا تھا۔ ''آپ بہت سنجیدہ مذاق کر لیتی ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔ ''یہ مذاق ہرگز نہیں سچ ہے۔ میں اس کے والد کی چوتھی اور سب سے چھوٹی بیگم ہوں۔''

یہ بات تو ہمیں معلوم تھی کہ اقبال انکل نے پہلی بیوی کے فوت ہونے کے بعد چار بچوں کو سنبھالنے کے لئے ایک سنجیدہ سی خاتون سے شادی کی تھی۔ اس کے کچھ عرصے بعد ایک اور خاتون سے انہی کے گھر تعارف ہوا تھا۔ وہ ان کی تیسری اور پسند کی بیوی تھیں۔ اور اب یہ چوتھی بیوی!! میری پُرسوچ نگاہوں کو سمجھتے ہوئے بولی تھی۔

''میں خوش ہوں..... بہت خوش! بلکہ یقین مانو میں عیش کر رہی ہوں۔ اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتی ہوں کہ اقبال جیسے شخص کی بیوی ہوں اور یہ حقیقت ہے کہ مجھے ان سے بے تحاشا محبت ہو چلی ہے۔ وہ جاتے جاتے میرے ذہن میں کئی سوال چھوڑ گئی تھی۔

گزرتے وقت کے ساتھ میری اور اس کی دوستی پختہ ہوتی چلی گئی۔ ان کے گھر کے حالات نارمل ہی تھے۔ تینوں سوکنیں آپس میں بہنیں محسوس ہوتیں۔ چھوٹے موٹے جھگڑوں کو وہ خاطر میں نہ لاتی۔ شوہر کے گھر آتے ہی وہ پروانے کی طرح اس کی خدمت میں جت جاتی۔ اس کے ہاتھ پاؤں دھوتی، مالش کرتی، تازہ کھانا کھلاتی۔ خود تکلیف میں بھی ہوتی تب بھی جان شوہر میں اٹکی ہوتی۔ وہ شوہر کے لئے سراپا آسودگی تھی۔ جب بھی کوئی تجسس میں گھریلو حالات کی کرید لگاتا، وہ تشکر کا لبادہ اوڑھے ایک جذب سے کہتی چلی جاتی۔

''میں خوش ہوں، بے حد خوش..... بلکہ عیش کر رہی ہوں۔ میں ہی کیا، میری سوکنیں بھی عیش کر رہی ہیں وہ ہم سب سے برابر کا سلوک کرتا ہے۔ کسی کے لئے کمی نہیں کرتا۔ محبت بھی ہم سب سے کرتا ہے۔''

میں اس کی اس کیفیت پر حیران ہوتی اور ایک دن میں نے پوچھ ہی لیا۔

''تم یہ کیسے عیش کر رہی ہو؟ گھر تمہارا معمولی سا ہے۔ کھانا پینا بھی کوئی اعلیٰ نہیں نارمل سا ہے۔ اکثر تمہارے ہاں شوربے والے آلو پکتے ہیں۔ تم اتنی آسودہ کیسے ہو؟ اور یہ سب تمہیں عیش کیوں لگتا ہے؟''

میرا سوال غلط تھا یا پھر وہ اس کے لئے تیار نہ تھی اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔ اور پھر آنسو بہنے لگے۔ میری شرمندگی محسوس کر کے وہ گویا ہوئی۔

''تمہارا سوال غلط نہیں۔ میں بھی تمہاری جگہ ہوتی تو یہ ضرور سوچتی..... اور اگر میں والد کی وفات کے بعد کے دو سالہ ناگفتہ بہ

حالات سے نہ گزری ہوتی تو ان نعمتوں کی اس قدر قدر دان نہ ہوتی۔ ہم چار بہنیں اور تین بھائی ہیں۔ بھائی بڑے تھے۔ والد صاحب نے ان کی شادی کر دی اور وہ الگ ہو گئے۔ والد کی معمولی سی تنخواہ میں کھینچ تان کر گزارہ ہو جاتا تھا ہم اسی میں خوش اور مگن تھے۔ کوئی فکر اور پریشانی نہ تھی۔ وہ دن سخت ترین دن تھا جب کام سے واپسی پر ابو چار کاندھوں پر آئے ہمارے ابو ہم سے بچھڑ گئے تھے۔ ہماری جنت اجڑ گئی تھی۔ ہم غم سے نڈھال تھے۔ اور جب ہوش میں آئے تو رشتہ دار آہستہ آہستہ پاس سے چھٹ گئے۔ بھائی بھی دس دن بعد ایسے گئے کہ پلٹ کر خبر نہ لی۔ ہم چار بہنیں ماں کے تھکن زدہ چہرے کی طرف دیکھے جاتے جہاں کوئی امید نہ تھی آخر میں نے ہی ہمت کی۔ قریبی اسکول میں پڑھانا شروع کیا۔ چھوٹی بہن نے گھر سنبھالا اور درمیانی نے سینے پرونے کا کام شروع کیا۔ دونوں ناتجربہ کار تھیں اور ایسے کام میں لوگوں کے اعتماد کرتے ایک وقت لگتا ہے۔ لہٰذا کبھی دال روٹی کا بندوبست ہو جاتا اور کبھی فاقے ہوتے۔ اب تو رشتہ داروں نے گلی سے گزرنا تک چھوڑ دیا تھا۔

دن گزرتے رہے۔ ایک دن ایک رشتہ دار فروٹ اور سبزیوں کے بھرے تھیلوں کے ساتھ آئے۔ میری بوڑھی معصوم ماں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ کچھ دیر بیٹھے اور جاتے جاتے میرے قریب سے گزرتے کچھ ذومعنی باتیں کر گئے۔ میں ان باتوں میں الجھی عجیب کیفیت کا شکار تھی۔ تیسرے دن آٹے کے ساتھ وہ دوبارہ آدھمکے اس بار انہوں نے واضح طور پر کہا۔ آج رات بارہ بجے آؤں گا دروازہ کھلا رکھنا .....میرے تو پسینے چھوٹ گئے۔ مجھے سب سمجھ آ گیا۔ میں نے نہ جانے کس انجانی قوت کے تحت اپنے جوتے اتار کر اس کو مارے اور بولتی چلی گئی۔ میرے الفاظ مجھے بھی سمجھ نہ آئے تھے۔

وہ تو اس کے بعد نہ آئے۔ مگر وہ پہلا دن تھا جب ہم ابو پر ایک بار پھر روئے۔ پوری رات کمرے میں سمٹے بیٹھے ایک دوسرے کے آنسو پونچھتے رہے اور میری ماں خلاؤں میں نہ جانے کیا تلاشتی رہی اور پھر حالات نازک سے نازک تر ہوتے چلے گئے۔ ایسے واقعات کا سلسلہ جب تسلسل پکڑنے لگا تو میں زبان دراز ہو گئی۔ میں کہتی تھی مولوی اور گواہ لاؤ ہم سے نکاح کرو۔ دوسرا نکاح گناہ ہرگز نہیں۔ ہم عزت دار باپ کی بیٹیاں ہیں۔ خدا کا خوف کرو۔

انہی دنوں ایک کزن کے گھر جانا ہوا۔ وہاں اس کا شوہر اپنے قریبی دوست کا تذکرہ کر رہا تھا جس نے تیسری شادی کی تھی۔ میرے ذہن میں روشنی کا کوندا لپکا۔ جو تین نکاح کر سکتا ہے وہ چوتھے نکاح پر بھی تو تیار ہو سکتا ہے۔

اسی دن کسی بہانے کزن کے موبائل سے میں نے وہ نمبر یاد کر لیا اور اگلے دن اسکول سے واپسی پر پی سی او سے نمبر ملایا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا اور پھر اس کے نام کی تصدیق کے بعد اپنا مختصر تعارف کروا کر میں نے کہہ ڈالا۔ ''مجھ سے شادی کر لیں۔'' وہ بہت حیران ہوئے۔ انہوں نے اپنی تینوں بیویوں اور بچوں کے بارے میں صحیح صحیح بتایا مجھے کسی بات پر اعتراض نہ تھا۔ لہٰذا دو دن بعد ہی وہ نکاح کے لئے میری ایک قریبی دوست کے گھر گواہوں کے ساتھ موجود تھے۔ نکاح کے بعد انہوں نے گھر کا تمام سودا سلف دلایا خرچ کے لئے کچھ پیسے دیئے موبائل دیا اور ایک ہفتے بعد رخصتی کا کہہ کر چل دیئے ان دنوں میں مجھے اپنی ماں بہنوں کو صورتحال کے لئے تیار کرنا تھا۔ واپسی پر سامان سے لدے پھدے رکشے پر جب گھر پہنچی تینوں بہنیں خوشی سے بے حال ہو گئیں۔ ماں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ کئی دن سے کسی نے پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا تھا۔ میں خاموش بہنوں اور ماں کو کھانا کھاتے تکتی رہی.....تو آخر حالات اس نہج پر پہنچ گئے تھے جب ماں بہنوں پر پیٹ کی آگ نے کام دکھایا تھا۔ وہ بھول گئی تھیں کہ انہیں پوچھنا تھا، یہ اتنا سامان آخر تم کہاں سے لائیں؟

بھوک تو پہلے ہی نہ تھی، اب نیند بھی اڑ گئی۔ نکاح کی خبر پر بھائی لپکتے ہوئے آئے اور مجھے دھن کر رکھ دیا ہم ماں بہنوں کو نہ جانے کیا کیا کہا.....میں ڈھیٹ بن گئی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو تک نہ ٹپکا۔ مجھے ماں بہنوں تک نے مارا..... اور پھر بھائیوں نے ان الفاظ کے ساتھ رخصت کیا کہ ''ہمارے لئے آج سے تم مر گئیں۔'' وہ رات میرے دکھوں کی آخری رات تھی۔ میرے شوہر نے میری ماں اور بہنوں کی کفالت سنبھال لی۔ جلد ہی تینوں کو مناسب انداز میں دے دلا کر

رخصت کیا اور ماں کو میرے پاس لے آیا۔ آج میرے بھائی میرے تلوے چاٹتے ہیں۔

''اب بتاؤ.....کیا یہ حالات عیش نہیں؟''

☆.....☆.....☆

میری نگاہیں گہری نیند میں مسکراتے اس کے ہونٹوں پر تھیں اور میں یقین سے کہہ سکتی تھی کہ کل جب وہ دوبارہ میرے پاس آئے گی تو مسکراتے ہوئے کہے گی ۔ اس نے صحیح دھمکی دی تھی کبھی کبھی میں بھی تو اسے زچ کرنے لگتی ہوں۔ خوامخواہ موڈ خراب کر بیٹھتی ہوں۔ خیال بھی نہیں کرتی کہ وہ دن بھر ہمارے لئے محنت کرتا تھکا ہارا آیا ہے اسے بھی تو سکون چاہیے ہوتا ہے..... میرا شوہر محنتی بھی تو بہت ہے ۔ روزانہ ہاتھوں میں گٹے پڑے ہوتے ہیں۔ ٹھیکیدار ہے مگر خود بھی مستری کا کام کرتا ہے۔ آخر اسے اتنے بڑے کنبے کو سنبھالنا جو ہوتا ہے.....اور اس کی نگاہیں گھڑی پر ہونگی ۔ میں جاتی ہوں مجھے اس کے لئے کلیجی بھوننی ہے، بس آنے ہی والا ہوگا۔ اور پھر اپنی چوڑیاں اور کنگن دکھائے گی اور شرماتے ہوئے کہے گی، یہ کل وہ مجھے منانے کے لئے لایا تھا۔ اسے پتہ ہے کہ میں دیوانی ہوں کنگنوں اور چوڑیوں کی ۔ دیکھتے ہی مچل جاتی ہوں ۔ زیادہ نخرے نہ دکھا سکوں گی ۔ چالاک کہیں کا..... یہ بھی جانتا ہے میں اس سے زیادہ دیر ناراض رہ ہی نہیں سکتی۔

☆.....☆.....☆

اسمائے حسنیٰ

نصرت محمود قریشی

الحمید

'الحمید' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ میں سے ایک نام ہے جس کا مادہ 'حمد' ہے۔ حمد کا مطلب ہے تعریف کرنا، سراہنا، حسن عمل کی ستائش کرنا، شکریہ ادا کرنا اور بدلہ دینا۔

اور 'حمید' چونکہ فعیل کے وزن پر بمعنی مفعول ہے۔ اس لئے اس کا مطلب ہے وہ جس کی تعریف کی جائے جو سراہے جانے کے قابل ہو، جس کے حسنِ افعال کی ستائش کی جا سکے، جس کا شکریہ ادا کیا جانا چاہیے اور حتی الواسع اس کو بدلہ بھی دیا جانا چاہیے ۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنے اور سراہنے کی تو سمجھ آتی ہے۔ حسنِ افعال کی ستائش کرتے ہوئے کبھی کبھار ہم شکریہ بھی ادا کر دیتے ہیں۔ لیکن 'الحمید' کے معانی میں یہ جو بدلہ دینے کا کام ہے یہ سمجھنا ذرا مشکل ہے۔ ثعلب نے کہا، ''**الشکر لا یکون الا عن یدٍ**'' اللہ تعالیٰ کی تعریف (حمد) اور اسکا شکر ہاتھ ہلائے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔'' تو جب ہم ہاتھ ہلائیں گے تو عملی شکر ادا ہوگا۔ مثلاً ہم اس کی دی ہوئی بے شمار دولت میں سے اس کے بندوں کی ضروریات پوری کریں گے تو یہ بدلہ ہوگا اس نعمت کا جو اس نے ہمیں دی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''**من ذا الذی یقرض اللہ قرضا حسنا**'' یہ قرض حسنہ اللہ تعالیٰ (غنی) اپنے لئے تو نہیں مانگ رہا۔ یہ اپنی اس اتنی خوبصورت دنیا کے توازن کو قائم رکھنے کے لئے کہہ رہا ہے۔ پانی کا گلاس پی کر الحمد للہ کہیں مگر واش روم میں نلکے کھلے چھوڑ کر روزانہ پورچ اور گلیاں دھلوا کر سینکڑوں لٹر پانی ضائع نہ کریں الحمد للہ کے اس رخ پر بھی غور کر لیں۔

محمد بن مکرم کہتے ہیں ''یہ لفظ ''حمید''، فعیل کے وزن پر بمعنی معفول ہے، یعنی حمید بمعنی محمود۔ اللہ عزوجل کے لئے یہ صرف تقدیس کے معنوں میں نہیں آتا بلکہ حمد اور شکر کے معانی میں آتا ہے کیونکہ تم اللہ کی صفات کے لئے تو اس کا شکر ادا نہیں کرتے بلکہ اس کی عطا پر اسکا شکر ادا کرتے ہو۔ اور حدیث کے مطابق ''حمد راس الشکر ہے۔

☆.....☆.....☆

شمیم لودھی

ویران گھروندا

اُس نئی آباد شدہ کالونی کا ایک منفرد بنگلہ میرے سامنے تھا۔

گیٹ کھلتے ہی معتبر خاتونِ خانہ نے باہر قدم رکھے اور میرے قدموں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے لگی۔ ہم قدم ایک دلچسپ شخصیت ہو تو سیر کا لطف دو چند ہو جاتا ہے۔ نئی ملاقات کی دعا تو دل میں تھی ہی۔ علیک سلیک یعنی مختصر تعارف کے بعد طویل سیر بھی ہو گئی۔

ایک قریبی مسجد میں نمازِ جمعہ بیگم صبیحہ جیلانی باقاعدگی سے ادا کرتی ہے۔ مجھے موقع ملا تو مسجد میں حاضری دی۔ خطبہِ جمعہ سنا تو اچھا لگا۔ امام صاحب بظاہر مختصر لیکن معنی کے لحاظ سے جامع خطاب کرتے۔ یوں کوشش رہی باقاعدگی ہو ان دونوں امور میں یعنی سیر میں اور نماز جمعہ میں۔ مسجد میں نئی خواتین سے نئی ملاقاتیں بھی ہو سکتی تھیں۔

پھر بیگم جیلانی کے گھر آنا جانا ہوا۔ صبیحہ جیلانی اپر کلاس میں اپنے شوہر کے ہمراہ متحرک رہتی۔ اپنے شوہر کی تیسری بیوی تھی۔ پہلی دو وفات پا چکی تھیں۔ سوتیلا ایک بیٹا اور ایک بیٹی بھی اسی بیگم کی ذمہ داری تھی۔ ایک دن اپنا مسئلہ بتایا کہ جیلانی صاحب میرے نام کوئی جائیداد نہیں کرتے حالانکہ انکا کاروبار سیٹ ہے۔ دوسری بار اگلا مسئلہ تھا کہ جیلانی نے خود تو حج، عمرہ ادا کیا ہوا ہے، میں کہتی ہوں تو اس طرف نہیں آتے۔ صبیحہ جیلانی نے سوتیلی بیٹی کی شادی کر دی۔ کچھ عرصہ بعد بیٹے کی شادی بھی دھوم دھام سے کی اور اپنے ملبوسات و زیورات کے ذوق شوق کی تکمیل بھی خوب کی جب بھی ملتیں ان کے اس شوق کا اظہار ضرور ہوتا مثلاً:

''رپل پلازہ ڈی گراؤنڈ سے دوکاندار سب سے پہلے نئی برانڈ میرے لئے پیک کروا کر مجھے فون کرتا ہے کہ باجی آ کر اپنا نیا پیکٹ وصول کر لیں۔ اس کے بعد تو کچرا رہ جاتا ہے جو دوسری بیگمات خریدیں گی۔''

ایک روز چلتے ہوئے ایک خاتون دکھائی دیں تو بیگم جیلانی نے اظہارِ خیال کیا۔

''اسے دیکھا ایک بڑے عہدے والے آدمی کی بیگم ہے، مگر ذرا بھی سلیقہ نہیں ہے کہ کبھی ڈھنگ سے نئی برانڈ کے لباس پہنے دیکھا ہو۔''

میں نے دبے الفاظ میں اختلاف رائے کیا کہ سادگی عین عبادت ہے۔ بڑے گھر کے بڑے گیٹ سے نکل کر کوئی سادہ لباس میں بڑی گاڑی میں سوار ہو تو بیگم صاحبہ بڑی ہی نظر آئے گی، کسی کی سادگی پر دل جلانے کی ضرورت نہیں۔ دل جلانے کے لئے معاشرے میں اور بہت کچھ دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ یوں کھٹی میٹھی باتوں کا تبادلہ رہا کرتا۔

ایک بار بہت خوش تھی کہ حج سے آئی ہوں۔ کچھ ماہ بعد عمرہ کی ادائیگی سے واپسی پر جہاز میں ہی اگلی خواہش سر اٹھانے کو تھی۔

''میرے نام جائیداد کتنی کرو گے؟''

جیلانی صاحب کی چڑ تھا یہ مطالبہ..... یوں جہاز سے واپس گھر تک تو تکار بڑھ گئی۔ بیگم صبیحہ جیلانی اپنے اندر بھرے غصے کا اظہار اور طریقوں سے کرنے لگی۔ ''اس کمرے کا اے سی کہاں گیا؟ میری اجازت کے بغیر دوسرے کمرے کی سیٹنگ کون تبدیل کر سکتا ہے؟ ڈرائینگ روم میں بھی کچھ نہ کچھ بدلا ہے..... یہ گھر فوراً میرے نام رجسٹری کروادو.....''

اب تو جیلانی صاحب نے بھی پارہ چڑھا لیا اور فوراً حکم صادر کیا کہ ابھی اور اسی وقت کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکلو، تم یہاں سے کچھ بھی نہیں لے سکتیں۔ یوں:

بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

بڑے کروفر والی بیگم جیلانی اب باہر تھی۔ گیٹ بند ہو گیا اور یہ بند گیٹ جیلانی صاحب کے ہاتھوں سے دوبارہ کبھی نہ کھل سکا۔ مجھے دکھائی نہ دی تو موبائل پر کال کی۔ صبیحہ نے روتے ہوئے بتایا۔

''میرے والدین بھی نہیں ہیں۔ مجھے تخت سے تختے پر پھینک دیا گیا ہے، بھائی کے گھر پر کب تک پڑی رہوں گی۔ جیلانی میری آوہ بکا نہیں سنتا، مجھے لٹکتا چھوڑ رکھا ہے۔''

چند ماہ بعد دیکھا جیلانی صاحب کا گھر بند پڑا تھا۔ اُدھر بیگم جیلانی کا فون بھی بند ہی ملا۔ چند واقفانِ حال نے بتایا کہ اب وہ بیگم جیلانی نہیں ہے۔ کچھ عرصہ بھائی بھابھی کے گھر میں رہی۔ اب ادھر سے طلاق کے بعد اور جگہ نکاح کر لیا ہے اس آدمی کی پانچ جوان اولادیں ہیں۔ ان کے ساتھ معرکہ آرائی میں بہت تنگ ہے اور پچھتاوے میں ہے۔

ادھر جیلانی صاحب نے گھریلو ملازمہ سے سب کچھ اگلوا لیا۔ پتہ چلا کہ جیلانی کی عدم موجودگی میں وہ کچن کا راشن، کراکری تک جو بیٹی کے جہیز میں اڑائی گئی تھی اپنے بھائی کے گھر پہنچا دیتی۔

ہوس اور بددیانتی کا یہ ہولناک انجام خوشحال گھر کو ویران کر گیا۔

☆.....☆.....☆

حبیب الرحمن

میری کہانی میری زبانی

قیام پاکستان اور ہجرت کے پس منظر میں لکھی ہوئی داستان جو شعور و لاشعور کی گڈ مڈ ہوتی سرحدوں سے گزر کر نکھر گئی ہے

میں جب دنیا میں آیا اس وقت پاکستان ٹھیک پانچ سال ایک ماہ اور ایک دن کا ہو چکا تھا۔ وہ بچہ (اس وقت کا) جو پاکستان بننے کے پانچ برس بعد پیدا ہوا ہو اس کو کیا معلوم ہوگا کہ پاکستان کیسے بنا.....لیکن..... معلوم نہیں کیوں مجھے پاکستان بننے سے بھی دو تین برس پہلے کے حالات و واقعات ہی نہیں، قتل و غارت گری کے سارے مناظر اس طرح یاد ہیں جیسے وہ سب کچھ میری چشم حقیقت کے سامنے ہوا ہو۔

ایسا کیسے ممکن ہے؟ میرے لئے یہ سوال بہت اہم بھی تھا اور پریشان کن بھی۔

شاید ہی کوئی اس بات کا یقین کرے کہ جب میں عمر کے اس مرحلے میں داخل ہوا جہاں کوئی بچہ ہوتا تو بہت ہی چھوٹا بچہ ہے لیکن اس کا ذہن بہت ساری باتوں کا تجزیہ کرنے کے قابل ہو چکا ہوتا ہے تو اس وقت سے لے کر پندہ سولہ برس کی عمر تک پہنچنے تک میں خود حیران اور پریشان رہتا تھا کہ وہ تمام واقعات اور مناظر جو میری پیدائش سے بھی کئی برس قبل کے ہیں وہ مجھے اس طرح کیوں لگتے ہیں کہ جیسے میرے دیکھے ہوئے اور سنے ہوئے ہوں۔

مجھے اسکول میں داخلہ لئے ہوئے بھی اب چار پانچ برس ہو چکے تھے، یہ اس زمانے کی بات ہے جب سات آٹھ سال کی عمر تک پہنچنے سے قبل بچوں کو اسکول میں داخلہ ملا ہی نہیں کرتا تھا (میں یہ بات پنجاب کے سرکاری اسکولوں کے بارے میں کہہ رہا ہوں)۔

اکثر ہوتا یہ تھا کہ میں اسکول ہوتا یا گھر، نہ جانے کیوں میرا ذہن اسی سوچ کی جانب بھٹک جاتا تھا۔ مجھے پڑھتے پڑھتے کہیں سے چیخ و پکار کی آوازیں آتیں، شور و غوغا بلند ہوتا ہوا محسوس ہوتا، کبھی تلواروں کی جھنجھناہٹ سنائی دیتی، کبھی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی فریادیں کان پھاڑنے لگتیں اور دور کسی بستی سے آگ کے شعلے اور دھوؤں کے مرغولے بلند ہوتے نظر آتے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس سارے دورانیہ میں نہ تو میری کوئی ڈری ڈری کوئی آواز بلند ہوتی اور نہ ہی کوئی ایسی حرکت سرزد ہوتی کہ کوئی میری اس سوچ کو کسی قسم کا نام دے بیٹھتا اور اس طرح میں اور میرے والدین کسی پریشانی کا شکار ہو جاتے۔ البتہ یہ ضرور ہوتا کہ خواہ میرے اساتذہ ہوں یا والدین اور بہن بھائی، وہ مجھے زور زور سے آوازیں ضرور دیا کرتے تھے اور مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے کسی نے مجھے بہت بلندی سے پستی کی جانب دھکیل دیا ہو۔

یہ کیفیت بیشک کبھی کبھار ہی ہوتی لیکن جب جب بھی ہوتی اور اس کیفیت کے بعد کسی کی آواز یا ڈانٹ کے بعد جب میری واپسی ہوتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے میرا پورا وجود ہل کر رہ گیا ہے

جس عمر سے میں نے اس مسئلے کی جانب سوچنا شروع کیا اس وقت میری عمر غالباً چھ سال کی رہی ہوگی۔ اب جبکہ میں دس بارہ سال کی عمر کو پہنچ چکا تھا، تو اپنی سوچوں، ان تمام مناظر اور واقعات کو جو مجھے بہت اچھی طرح دیکھے اور سنے لگتے تھے، انھیں کریدنے کی جستجو بھی پیدا ہوئی اور میں اس حد تک سوچنے کے قابل ہو گیا کہ جب تک میں معاملے کی تہہ تک نہیں پہنچوں گا، میرے دل و دماغ کی یہ کھلبلی ختم نہیں ہو سکے گی۔

یہاں تھوڑی دیر کے لئے میں اپنی اس کہانی کو روکتا ہوں اور اپنا اور اپنے خاندان کا ذکر چھیڑنا چاہتا ہوں اور سامعین سے ملتمس ہوں کہ وہ بہت انہماک کے ساتھ کہانی کے اس حصے کو سنیں کیونکہ آگے چل کر کہانی کا یہ حصہ، بیان کردہ پہلے حصے سے شیر و شکر کی طرح یوں آ جڑے گا کہ مجھے یہ بتانے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی کہ میں نے کہانی کے پہلے حصہ کو کہاں اور کیوں چھوڑا تھا۔

کہانی کا یہ حصہ میں اپنی والدہ محترمہ (مرحومہ) کی زبانی سنا رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ یہ ان ہی کے نام سے منسوب رہے، اس لئے کہ میں اس حصہ میں جو کچھ بھی بیان کر رہا ہوں وہ سب کچھ مجھے میری والدہ سے ہی معلوم ہوا البتہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان تمام معلومات کو لفظوں کی زبان میں دے رہا ہوں۔

میرے والد صاحب تقسیم ہند یا قیامِ پاکستان سے قبل، نواب آف بہاولپور کے سفارتی عملے میں شامل تھے۔ ریاست بہاولپور اس موجودہ پاکستان کی ہر لحاظ سے ایک بہت بڑی اور طاقتور ریاست تھی جس کا طول وعرض کچھ اس طرح تھا کی سندھ میں صادق آباد سے پہلے (کراچی سے لاہور جاتے ہوئے) ایک ریلوے اسٹیشن آتا ہے جس کا نام ''سرحد'' ہے وہاں سے اس ریاست کی سرحد شروع ہوتی تھی اور ایک جانب لودھراں تک جاتی تھی اور دوسری جانب یہ ریاست بہاولنگر تک پھیلی ہوئی تھی۔ پھر برطانیہ کے قانون کے مطابق اس ریاست کو یہ قانونی حق حاصل تھا کہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد اگر وہ آزاد رہنا چاہتی ہے تو آزاد رہے اور پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہتی ہے تو الحاق کر لے، اس سلسلے میں اسے برطانیہ کے قانون کا مکمل تحفظ حاصل تھا۔

اس وقت کے مسلمانوں کا جذبہ قابل دید بھی تھا اور قابل داد بھی، مسلمان تو مسلمان، مسلمانوں کا رواں رواں اس وقت ایثار وقربانی کا جیتا جاگتا شاہکار بنا ہوا تھا، چنانچہ ادھر پاکستان کا اعلان ہوا ادھر اس وقت کے نواب آف بہاولپور نے غیر مشروط طور پر اپنی پوری ریاست اور خود اپنا سب کچھ حکومت پاکستان کے حوالے کر دیا اور اس طرح ایثار وقربانی کی ایک ایسی بے مثل کہانی رقم ہوئی جس کو تاریخ اسلام کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔

ریاست بہاولپور کا ایک سفارت خانہ ''دہلی'' میں بھی تھا اور اسی کے سفارتی عملے میں میرے والد صاحب بھی شامل تھے۔

جوں جوں تحریک پاکستان زور پکڑتی جا رہی تھی اور پاکستان خواب وخیال اور تصور سے حقیقت کے سانچے میں ڈھلتا نظر آ رہا تھا، توں توں ہندوؤں اور سکھوں کی متشددانہ سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ ہندو مسلم فسادات معمول بنتے جا رہے تھے، روز کی نئی نئی اور پریشان کن خبروں نے رات کی نیندیں اور دن کا سکون غارت کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ سفارت خانہ اور ان سے ملحقہ رہائشی علاقہ جو اب تک کافی پرسکون اور محفوظ تصور کیا جا رہا تھا اس پر بھی خوف کے سائے بری طرح لہرانے لگے تھے۔ اس سفارت خانے کے مرد حضرات کی باہر کی سرگرمیاں کسی اچھے تاثر کا اظہار تو نہیں کر رہی تھیں لیکن جب بھی میری والدہ میرے والد سے کچھ دریافت کرتیں تو یہی طفل تسلی سننے کو ملتی کہ خطرے کی کوئی بات نہیں لیکن اگر اللہ نہ کرے ایسا ہوا بھی تو پہلے ہماری جان جائے گی۔ ان کا یہ آخری جملہ جسم میں کپکپی پیدا کر دیا کرتا تھا۔ آس پاس رات ہو یا دن، اکثر چیخ وپکار اور آہ وفغاں کا سنائی دینا معمول بنتا جا رہا تھا، پاکستان بن جانے کی نوید سنائی دے چکی تھی لیکن یہ سب آہیں اور سسکیاں، دور بستیوں سے اٹھتا دھواں اور آگ کی لپٹیں دماغ کو چیرے اور دل کو پھاڑے دے رہی تھیں لیکن کیونکہ ابھی تک سفارتی عملے کو کسی بھی جگہ جانے کی ہدایت نہیں ملی تھی اس لئے ہم سب لوگ سب کچھ اپنے رب پر چھوڑ کر دل کو تسلیاں دے دے کر بہلا لیا کرتے تھے۔

ایک دن نماز فجر کے بعد، جبکہ ابھی سورج کی پہلی کرن بھی طلوع نہیں ہوئی تھی، والدہ پریشانی کے عالم میں نماز پڑھ کر دروازے کے جھروکوں سے باہر کے حالات کا جائزہ لے رہی تھیں، رات بھر کوئی اچھی خبریں بھی نہیں سنی تھیں، فائرنگ اور چیخ وپکار کے علاوہ دور کئی مکانوں سے شعلے بھی بلند ہوتے دیکھے تھے، مردوں کو بھی بہت پریشان پایا تھا، میرے والد صاحب نے بھی کئے گئے سوالات کے بہت تسلی بخش جوابات نہیں دیئے تھے اس لئے چاندنی پھیلتے ہی والدہ بھی اضطراب کے عالم میں گھر سے باہر کھڑے مردوں کی سرگرمیوں اور بے چینیوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش میں مصروف تھیں کہ اتنے میں سفارت خانے کی ایک کار کو بہت سرعت کے ساتھ داخل ہوتے اور رکتے دیکھا، سارے مرد اس کی جانب بڑھے، ڈرائیور کو عجلت کے ساتھ گاڑی سے اترتے دیکھا، اس نے جلدی جلدی کوئی پیغام دیا۔ ادھر وہ گاڑی کی جانب مڑا ادھر سارے کے سارے مرد سراسیمگی کے عالم میں اپنے اپنے گھروں کی

جانب تیز تیز جاتے دکھائی دیئے۔

یااللہ خیر، میری والدہ کے منہ سے ابھی اتنا ہی نکلا تھا کہ دروازہ بہت زور دار آواز کے ساتھ کھلا، والدہ نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ والد صاحب بھی اور مردوں کی طرح نہایت تیزی کے ساتھ گھر کی جانب آرہے ہیں اس لئے وہ دروازے سے کافی دور بہت خوفزدگی کے عالم میں کھڑی تھیں اگر وہ پہلے کے سے انداز میں دروازے پر جمی کھڑی ہوتیں تو شاید دروازہ کھلنے پر وہ زخمی ہی ہوجاتیں۔

تم یہاں کیا کر رہی تھیں؟ چلو جلدی کرو، جو کچھ بھی اپنے ہمراہ لے سکتی ہو لے لو بس ابھی کے ابھی سفارت خانے کے دو ٹرک آئیں گے، اس میں بیٹھ جانا ہے، سنا ہے کہ بہت پر جوش و پر تشدد ہجوم سفارت خانے کی جانب کر پانیں، برچھیاں بھالے لے کر بڑھ رہا ہے، وقت نہیں ہے بس جو بھی ہاتھ لگے ہمراہ لے لو، زندگی رہی اور سفارت خانہ اور ہمارے گھر بچ رہے تو واپسی پر دیکھ لیں گے۔

ابھی لوگ سمیٹا سمیٹی میں ہی لگے تھے کہ ٹرک آن کی آن میں ہارن بجاتے احاطے میں داخل ہوئے اور کہا کہ فوراً اس میں آن بیٹھو، جلدی کرو، ہجوم اب سر پر پہنچنے والا ہے۔ اب کہاں کا سامان، بات تو عزت و آبرو اور جان بچانے کی آ گئی تھی۔ والدہ قسمیہ کہتی ہیں کہ جو جس کے جسم پر تھا، یا پیر میں تھا وہی ان کا اسباب تھا، کسی کو ذرا بھی فرصت نہیں ملی کہ قیمتی اشیا تو درکنار، اپنے ساتھ پہنے اوڑھنے کے لئے ایک دو کپڑوں کے جوڑے ہی رکھ لیتا۔ لوگ نہایت عجلت میں اپنے اپنے بچوں بڑوں اور عورتوں کے ساتھ ٹرکوں میں سوار ہوئے اور ڈرائیوروں نے بھی نہایت تیز رفتاری کے ساتھ وہاں سے روانگی اختیار کی اور اس طرح شاہی مسجد (دہلی) پہلی منزل قرار پائی۔

چند ہی گھنٹوں میں یہ خبر بھی آ گئی کہ سفارت خانے میں بہت توڑ پھوڑ ہوئی، انڈین پولیس نے سفارت خانے کو تو مکمل تباہی سے بچا لیا لیکن وہ رہائشی علاقے کے تحفظ میں (جانے یا انجانے) مکمل ناکام رہی، پہلے تو بلوائیوں نے ایک ایک گھر کا تمام مال و اسباب لوٹا پھر سارے گھروں کو آگ لگا دی۔

یہ ایسا وقت تھا کہ اس تباہی پر سوچنے کا بھی ہوش نہیں تھا، دعا یہی تھی کہ ہم نے جس اللہ کے گھر میں پناہ لی ہے اللہ ہم سب کی جان و مال کی حفاظت فرمائے۔ مسجد میں یوں لگتا تھا کہ سارا دہلی امنڈ آیا ہے، بہت بھاری تعداد میں مسلمان خواتین، مرد بچے بچیاں اور بوڑھے بوڑھیاں یہاں جمع تھے۔ ایک بہت بڑی تعداد مردوں کی ایسی بھی تھی جنھوں نے حفاظت کی ذمہ داری رضا کارانہ طور پر اپنے ذمہ لے لی تھی۔ والدہ بتاتی ہیں کہ رضا کارانہ طور پر حفاظت کی ذمہ داریاں سنبھالنے والوں کی واضح اکثریت ان لوگوں کی تھی جو اخلاقی اعتبار سے اور ظاہری رکھ رکھاؤ سے کسی اچھی شہرت کے حامل نہیں تھے لیکن اس موقع پر وہ غیرت و حمیت کے برجیس وثریا سے بھی زیادہ بلند اور روشن ستارے بنے ہوئے تھے۔

والدہ بیان کرتی ہیں کہ ایک دو دنوں میں ہی یہ احساس ہو چلا تھا کہ مسجد بہت محفوظ جگہ نہیں، اس دوران کئی بڑے بڑے حملے بھی ہوئے جس کو سیسہ پلائی دیوار کی طرح مسلمان مجاہدوں نے پسپا کیا، کئی شہادتیں بھی ہوئیں لیکن کسی دشمن کو مسجد کے اندر داخل نہیں ہونے دیا، پھر معلوم ہوا کہ دہلی کے قلعے میں مسلمان جمع ہو چکے ہیں اور اس کی محافظت مسلمانوں کے ایک بہت بڑے دستے کے سپرد ہے، چنانچہ لوگوں نے اجتماعی طور پر قلعے میں منتقل ہونے کا پروگرام ترتیب دیا کیونکہ اس بات کا ڈر تھا کہ مسلمانوں کی کم تعداد دیکھ کر کہیں درندوں کی خصلت بیدار ہوجائے اور وہ کمزور پا کر یا تعداد میں کمی دیکھ کر حملہ آور نہ ہوجائیں۔

والدہ کہتی ہیں کہ وہاں تنگی میں کچھ کشادگی محسوس ہوئی، ہر کام نظم و ضبط کے تحت ہوتا تھا، کھانا بھی جیسا تیسا ہی سہی، سب کو مل جاتا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خطرہ جو مسجد میں محسوس ہو رہا تھا اس کی شدت یہاں بہت کم تھی، مسلمانوں اور مسلمان محافظوں کی تعداد دیکھ کر بلوائیوں نے اس طرف کا رخ کرنے کی جرأت نہیں کی، البتہ چھیڑ چھاڑ ضرور ہوتی رہی جس پر محافظین قابو پا لیا کرتے تھے۔

اسی طرح چار پانچ دن گزر گئے، حالات بھی کسی حد تک پرسکون ہوتے نظر آنے لگے، والد صاحب ہندوؤں کا بھیس بدل کر حالات کا جائزہ اور کچھ ضروری اشیا خریدنے کے لئے شہر کا چکر لگانے نکل جاتے۔

ایک دن کا واقعہ ہے وہ شہر میں گھوم رہے تھے کہ کسی نے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کان میں ہلکی سی سرگوشی کرتے ہوئے کہا ''یحیٰی صاحب'' والدہ بیان کرتی ہیں کہ والد صاحب نے کہا کہ ان کی جان ہی نکل گئی اور انھوں نے سوچا کہ آخر کار وہ پہچان ہی لئے گئے، لیکن رکنے والے نے ان کو پکڑ کر اپنی جانب رخ موڑتے ہوئے کہا کہ آپ کہاں؟ جب انھوں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ نواب کے جہاز کا پائلٹ ہے اور وہ بھی بھیس بدل کر گھوم رہا ہے۔

اس نے فوراً کہا کہ کسی بھی قسم کی حیرت اور خوشی کا اظہار نہ کریں، میں نے اسی لئے آپ کو زور سے آواز نہیں دی کہ کہیں نام سے آپ کو نہ پہچان لیا جائے۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ آپ سے ملاقات ہوئی، میں کل صبح ہی صبح پاکستان کے لئے جا رہا ہوں، سفارت خانے کا بچا کھچا سامان منتقل کرنا ہے، اگر آپ اور آپ کے اہل خانہ فجر کے وقت ائیر پورٹ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو میں آپ کو پاکستان لے جاؤں گا۔ ہاں یہ بات یاد رکھیں کہ اپنی اہلیہ کو اور خود کو ہندوانہ لباس اور حلیہ میں ہی لائیے گا، عبایا وغیرہ سے اجتناب کیجئے گا، ہندو خواتین کی طرح چہرے پر لمبا سا پلو لٹکا لیجئے گا۔ سارا شہر سفارتی عملے کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ بس ہوشیار رہیے گا۔ اللہ حافظ۔

یہ کہہ کر وہ تو یہ جا وہ جا، اور والد صاحب اپنی پناہ گاہ پر لوٹ آئے اور اپنی ساری داستان میری والدہ کو سنا دی جس سے ایک موہوم سی امید نے جسم و جاں میں ایک نئی امنگ نے جنم لینا شروع کیا۔

ان دونوں نے اس بات کا ذکر اپنے اردگرد موجود کسی سے بھی نہ کیا اور منہ اندھیرے کسی کو بتائے بغیر نہایت خاموشی کے ساتھ قلعے سے باہر آئے، تانگا کیا اور اور ایئر پورٹ کی جانب روانہ ہوئے۔ اس رات پھر ہنگامے پھوٹ پڑے تھے اور کافی جانی نقصان ہوا تھا، والدہ اور والد کو بھی بہت امید نہیں تھی کہ اس عالم میں وہ ایئر پورٹ پہنچ سکیں گے، ٹانگے والے کو بھی ائیر پورٹ کے قریب کی بستی کا ہی پتہ بتایا تھا اور یہ طے ہوا تھا کہ باقی راستہ وہ پیدل ہی طے کریں گے۔ راستے میں ننگی تلواریں لہراتے گھومتے پھرتے کافی لوگوں پر بھی نظر پڑی اور جگہ جگہ خون نے رات کے ہنگامے کی خبر کی تصدیق بھی کی۔ ہر منظر کو دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا بھی محسوس ہوا لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے، ائیر پورٹ سے پہلے ہی وہ ایک بستی میں اتر گئے اور دعا مانگتے مانگتے آخر کار وہ ائیر پورٹ کی حدود میں داخل ہوئے اور یہ دیکھ کر خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ نواب کے جہاز کا پائلٹ ان کا منتظر تھا۔ یہاں کوئی خطرہ نہ تھا، اس لئے اس نے خوب گرم جوشی سے استقبال کیا اور میرے والد سے کہا کہ اب اپنا حلیہ درست کر لیں، میں آپ کے لئے ایک جوڑا لایا ہوں اسے پہن لیں اور پھر میری والدہ کے لئے کہا کہ میں ایک عبایا بھی لایا ہوں بس آپ اسے پہن لیں یہی کافی ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں سب لوگ جہاز میں تھے، تھا تو یہ مسافر جہاز لیکن اس کی ساری سیٹیں نکال کر اس کو سامان بردار جہاز کی شکل دیدی گئی تھی اس لئے اس میں سامان کے ساتھ ہی ان کو بٹھا دیا گیا اور اس طرح یہ سفر بہاولپور کی ایئر اسٹرپ پر اختتام پذیر ہوا۔

یہاں سے کہانی کا ایک نیا موڑ شروع ہوتا ہے۔ نواب کے پاس ایک یا دو دن قیام کے بعد بہاولپور شہر کے بیچوں بیچ، شہزادی چوک کے قریب ایک بہت مشہور بازار تھا جس کو آج بھی مچھلی بازار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جبکہ میں نے اپنے ہوش میں اس کے آس پاس بھی کبھی مچھلیاں فروخت ہوتے نہیں دیکھی تھیں، اس کی ایک مشہور گلی تھی جو ''دال والی'' گلی کے نام سے مشہور تھی، یہاں میں نے اپنے ہوش میں بہت بڑے پیمانے پر دالیں دھلتے ضرور دیکھیں لیکن اب ایسا نہیں ہے کیونکہ درمیان میں جب جب بھی جانا ہوا میں نے اس گلی میں ایسا کوئی منظر نہیں دیکھا۔ اس گلی میں ایک بہت بڑا مندر تھا، اور ایک بہت ہی بڑی رہائشی عمارت بھی تھی جو بلاشبہ ایک حویلی کی طرز کی تھی، بہت وسیع عریض، دس بارہ کمروں پر مشتمل، کمرے بھی خوب کشادہ، چار کمروں کے فرش اور اندرونی صحن کے فرش کا قریب قریب ایک تہائی حصہ سنگ سیاہ اور سنگ سفید کے ٹائلوں سے مزین تھا۔

اس عمارت کے دو صحن تھے، ایک وہ جو اندر داخل ہوتے ہی شروع ہوتا تھا، صحن کا یہ حصہ کچا تھا، سنا ہے اس میں ہاتھی بھی رکھے جاتے

تھے۔شاید یہ بات صحیح تھی کیونکہ اس میں اٹھارہ بیس فٹ اونچا اور بارہ فٹ چوڑا چوبی اور قلعہ کے دروازوں کی مانند مضبوط دروازہ تھا، جس میں ایک چھوٹا دروازہ عام آمدورفت کے لئے رکھا گیا تھا۔اس کے علاوہ ایک اور بہت کشادہ مضبوط اور منقش چوبی دروازہ اور بھی تھا جس سے عام آمدو رفت اور سامان لانے لیجانے کی آسانی بھی تھی، میں نے اپنے ہوش میں اسی دروازے کو استعمال ہوتے دیکھا تھا، بڑا دروازہ تو شاید کبھی کھلا ہی نہیں تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی ایک صحن عبور کرنے کے بعد ایک وسیع ورانڈہ تھا جس میں تین صدر دروازے، وہ بھی قلعے نما چوبی دروازے تھے اور بہت ہی نقشین تھے جن کے نقش ونگار اس لئے چھیل دیئے گئے تھے کہ اس پر دیوی دیوتاؤں کی تصاویر کندہ تھیں۔کمروں کے دروازے بھی اپنی مثال آپ تھے اور اس کے علاوہ بھی لکڑی کا بہت عمدہ کام ہوا ہوا تھا جس سے اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ عمارت کن لوگوں کے زیر استعمال رہی ہوگی۔

میرا خاندان ہی نہیں، میری ایک بہت بڑی برادری ہندوستان سے پاکستان آنے والوں میں خوش قسمت ترین خاندان اور برادری رہی ہوگی اس لئے کہ میں نے آج تک کسی کی زبانی کبھی یہ نہیں سنا کہ اس ساری ہنگامہ آرائی میں کسی کا جانی نقصان ہوا ہو اور ان تمام برادری والوں میں میرے والدین بلاشبہ اللہ کی رحمت کے ٹھنڈے اور گہرے سائے تلے تھے۔

والد صاحب کے ساتھ اس ساری مہربانی میں نواب کا اور ان کے عملے کا بہت بڑا ہاتھ تھا لیکن نواب نے مزید ملازمت جاری رکھنے سے انکار کر دیا تھا اس لئے تمامتر آسائشوں کے باوجود نوبت فاقوں تک پہنچنے لگی۔

حویلی سے ملحقہ ایک شاپ تھی جس کا ایک دروازہ اندر کی جانب کھلتا تھا، اس میں بہت ساری اشیا بھاری تعداد میں موجود تھیں۔ہر قسم کی دالیں، چاول، تیل، شکر اور مصالحہ جات، لیکن جو چیز مانع تھی وہ یہ تھی کہ ان کے پاس اس کے مالک کی اجازت نہیں تھی اور مالکوں کا علم نہیں تھا کہ اب وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔

کہتے ہیں کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ایک دن حکومت والے آ گئے، انھوں نے دکان کی سیل توڑ کر اندر کے دروازے کا بھی جائزہ لیا، وہ ابھی تک سیلڈ تھا، ان کو بڑی حیرت ہوئی، دربجا کر حقیقت حال معلوم کرنا چاہی تو والدہ نے دروازے کی اوٹ سے جوابات دیئے، آپ کے گھر میں کیا کھانے پینے کی اشیاء موجود ہیں؟ کئی دنوں سے ہم نے صرف روٹی کے علاوہ کوئی شے نہیں کھائی وہ بھی نمک کے ساتھ اور وہ بھی پیٹ بھر کر نہیں، والدہ نے جواب دیا۔کیا آپ کے علم میں یہ بات نہیں کہ آپ کا ایک دروازہ اس دکان کے اندر بھی کھلتا ہے؟ کیوں نہیں، اور یہ بھی علم ہے کہ یہ ایک بہت بڑی شاپ ہے اور اس میں ضروریات زندگی کی بیشمار اشیا ہیں۔تو پھر آپ نے دروازہ کیوں نہیں کھولا؟ اس پر ہمارا کیا حق بنتا ہے؟ والدہ کا جواب تھا

والدہ بتاتی ہیں کہ پھر اس کے بعد کوئی سوال نہیں کیا گیا اور سارا دن ہاتھ گاڑیوں، گدھوں اور گدھا گاڑیوں پر لد لد کر سامان لیجایا جاتا رہا۔والد صاحب کو بسلسلہ تلاش روزگار کراچی کی جانب روانہ ہوئے کئی دن گزر چکے تھے، وہ (والدہ) اور ان کے دو بچے اتنے لق و دق گھر میں تنہا ہی تھے۔جاتے جاتے وہ کافی مقدار میں آٹا چھوڑ گئے تھے، جو تھوڑی بہت دالیں تھیں وہ ختم ہو چکی تھی اس لئے گزارا اب روٹی اور پانی پر تھا۔شام کے وقت گھر کا دروازہ بجا، والدہ نے پریشان ہو کر سوچا کہ یہ بے وقت کون، دروازے کی اوٹ سے پوچھا کون؟ جواب آیا کہ حکومت کا ایک ذمہ دار اہل کار۔کیا بات ہے؟ آپ کے لئے کچھ دالیں اور اناج ہے لے لیجئے۔کیوں لائے ہو؟ لانے والے وضاحتی انداز میں پہلے معافی مانگتے ہوئے کہا کہ میں وہی ہوں جو صبح دکان سے سامان اٹھاتے ہوئے آپ سے کچھ سوال کر رہا تھا لیکن کیونکہ مجھے سرکار کی ایسی کوئی ہدایت نہیں تھی کہ میں اٹھائے گئے سامان میں سے اپنی مرضی اور منشا کے مطابق کچھ نکال سکوں اس لئے میں خاموش ہو گیا لیکن آپ کی خدا خوفی اور ایمانداری سے بہت متاثر ہوا۔مال جمع کرا کے آپ کی باتیں ان تک پہنچائیں، اب جو سامان میں لے کر آیا ہوں وہ

اجازت سے لے کر آیا ہوں اس کو سرکار کی جانب سے قبول کر لیجئے۔ والدہ کہتی ہیں کہ وہ کافی دیر تک اس تذبذب میں رہیں کہ لوں یا نا لوں لیکن جب جھروکوں سے جھانک کر اس اہل کار کو دیکھا تو انھیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ اہل کار جیسے چلتا پھرتا ایمان ہو۔ وہ کوشش کے باوجود انکار نہ کر سکیں اور شکریہ کے ساتھ اس کی پہنچائی ہوئی اشیا کو قبول کر لیا۔

سوچتا ہوں کہ کیا زمانہ تھا۔ لوگ کتنے سادہ اور اندر سے صاف ہوا کرتے تھے۔ والدہ نے یہ بھی بتایا کہ اس دن کے بعد سے وہ کبھی دکھائی نہیں دیئے گویا ان کو جو فرض بھی سونپا جاتا وہ اتنا ہی کیا کرتے ہونگے۔

زندگی کی گاڑی کبھی چلتی اور کبھی بغیر اسٹیشن بھی ٹھہر جایا کرتی، زندگی کا مقابلہ کرنے والے اپنے مسائل کا حل نکال ہی لیا کرتے ہیں۔ والد صاحب گو کہ کراچی جا کر ''پی آئی اے'' میں ملازم ہو گئے تھے لیکن اس وقت کا پاکستان اور اس میں ملنے والی تنخواہ سے والد صاحب کا اور ہمارا گزارا بہت مشکل سے ہوتا تھا۔ اس مشکل کا حل ''غلیل'' سے نکالا گیا۔ عمارت میں بیسیوں کبوتروں کا بسیرا تھا۔ صحن میں ایک بہت پرانا اور بہت گھنا ''بڑ'' کا درخت بھی تھا جس پر مختلف پرندے آ کر بیٹھا کرتے تھے چنانچہ جب کھانے کو کوئی اور اناج میسر نہیں ہوتا تو ان کا شکار بھی کر لیا جاتا۔

ہماری یہ عمارت جو اس وقت بھی اوقاف ہی کی ملکیت تھی اور آج بھی ہے وہ رحمتوں اور برکتوں سے بھری ہوئی تھی، بہاولپور میں مل جانے والی اس عمارت کی شہرت ہندوستان میں ہر عزیز و اقارب، قرابت داروں اور جان پہچان والوں تک پہنچ چکی تھی چنانچہ میرے سارے ددھیالی اور ننھیالی رشتے داروں کی پہلی منزل یہی عمارت بنی۔ اس زمانے میں لوگوں کے دل وسیع سے وسیع عمارتوں سے بھی زیادہ وسیع تر ہوا کرتے تھے اس لئے بعض اوقات اس میں پانچ پانچ خاندان بھی ٹھہر جایا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پردے کا خیال بہت زیادہ رکھا جاتا تھا چنانچہ گھر میں جگہ جگہ چادریں تان دی جاتی تھیں اور اس طرح یہ عمارت اندر سے کسی خیمہ بستی کا منظر پیش کرتی نظر آتی تھی۔

میرے خاندان اور میری ساری برادری نے 100 فیصد نہیں تو 95 فیصد نے ہندوستان کو بالکل ہی خیر باد کہہ دیا تھا اور پاکستان بننے کے ایک دو ماہ میں ہی ساری برادری ہجرت کر کے پاکستان منتقل ہو گئی تھی اور یہ سب اس لئے بھی آسان ہو گیا تھا کہ آنے والوں کو ایک ٹھکانا میسر تھا۔ میرا سارا ننھیال اور ددھیال کیونکہ ہندوستان سے ہی جماعت اسلامی سے وابستہ تھا اس لئے بہت سارے وہ افراد جن کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا وہ بھی ہمارے مہمان بنے جن میں قابل ذکر نام سید اسعد گیلانی کا آتا ہے۔

والدہ بتاتی ہیں کہ اکثر یہ بھی ہوتا کہ ''اس خیمہ بستی'' میں کوئی خاتون کھانے کے اوقات میں میرے پاس آ جایا کرتیں اور کافی وقت گزار دیا کرتیں اور اکثر میں خود ان میں سے کسی کے ''خیمے'' میں چلی جایا کرتی مگر شاید سب کا عالم یہی تھا کہ منہ سے کچھ نہیں کہا جاتا تھا طلب کھانے کی ہی ہوا کرتی تھی مگر حال سب کا شاید ایک ہی جیسا ہوا کرتا تھا۔

اللہ کا کرم ہے کہ جو بھی آتا وہ جتنا قیام کرتا وہ شاید بصد مجبوری ہی کرتا، کیونکہ چند دنوں بعد وہ اپنے اپنے روزگار کے مطابق دوسرے شہروں میں منتقل ہو جایا کرتے تھے چنانچہ میرے ایک چچا جو بہاولپور ہی کے سٹلائٹ ٹاؤن میں اور ایک چچا کراچی کی جانب چلے گئے جبکہ باقی پانچ چچا اور میری اکلوتی پھوپھی لاہور میں جا کر آباد ہو گئیں، اور تا حال ان کے خاندان اسی طرح بہاولپور، کراچی اور لاہور میں ہی آباد ہیں۔ ننھیالی رشتے دار بھی کچھ کراچی، کچھ لاہور، کچھ بہاولپور اور کچھ اسلام آباد میں آباد ہیں۔

اب ہماری عمارت کافی پر رونق ہو گئی تھی، بے شک ''خیمہ بستی'' اجڑ چکی تھی یعنی سب آنے والے اپنے اپنے روزگار کے مطابق اپنے اپنے شہروں اور گھروں میں منتقل ہو چکے تھے لیکن میری والدہ کی والدہ، ایک بھائی اور ایک بہن ہجرت کر کے ہمارے پاس ہی آ چکے تھے۔ اس کے علاوہ میری والدہ کی بڑی پھوپھی زاد بہن اپنے شوہر اور ایک بیٹے کے ساتھ یہاں پر ہی قیام پذیر ہو چکی تھیں۔ یہ وہ بہن تھیں جو آخری سانس تک اور اب سے چند سال قبل تک اسی عمارت میں مقیم رہیں اور

ایک ایسا دور بھی آیا جب وہ یکہ وتنہا بھی ایک طویل عرصہ تک اسی عمارت میں رہیں کیونکہ پہلے ان کے شوہر یعنی میرے خالو کا اور اس کے کچھ ہی عرصے بعد ان کے بیٹے کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ بہاولپور میں موجود میرے عزیز و اقارب نے بہت چاہا کہ وہ تنہا نہ رہیں لیکن معلوم نہیں کیوں ان کو اس عمارت سے اتنا پیار کیوں ہو گیا تھا کہ اس کو چھوڑنے کے لئے وہ بالکل آمادہ نہ ہوئیں۔

میرے دو بھائی تو ہندوستان سے ساتھ ہی آئے تھے، ایک سال بعد میرے بھائیوں میں ایک اور کا اضافہ ہوا، اس کے ایک ڈیڑھ برس بعد میری ایک بہن بھی آئی لیکن اس کی زندگی بہت مختصر تھی، اس کے بعد میری پیدائش ہوئی۔ میرے بعد ایک اور بہن کی ولادت ہوئی لیکن اس کی زندگی بھی بہت مختصر تھی، میرے اور اس کی عمر میں اٹھارہ ماہ کا فرق تھا لیکن وہ مجھے یاد رہ گئی۔ مجھے لیکن یہ بات نہیں سمجھ میں آسکی کہ وہ چلی کہاں گئی شاید یہی بات تھی کہ میں اکثر کسی کھڑکی یا دروازے پر اس کا انتظار کیا کرتا تھا۔ شاید میرے پاس اس کی کوئی تصدیق نہیں ہوتی تھی لیکن میری والدہ نے بتایا کہ جب بھی وہ مجھ سے دریافت کرتیں کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو تو میں فقط اس کا نام لیا کرتا تھا۔ میری ایک اور بہن جب دنیا میں آئی تو اس وقت میں ساڑھے تین سال کا ہو چکا تھا اور مجھے یوں لگا کہ میری وہی بہن واپس آ گئی ہے جس کا ذکر اکثر میری والدہ اس طرح کیا کرتی تھیں کہ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا کہ آہا! میری شاکرہ آ گئی، شاکرہ میری اسی بہن کا نام تھا جس کی پیدائش میری پیدائش کے ڈیڑھ پونے دو سال بعد ہوئی تھی اور چند ماہ میں ہی اس کا انتقال ہو گیا تھا۔

مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ شاکرہ (بہن) کا انتقال جہاں ہوا تھا وہ بہاولپور والا گھر نہیں تھا لیکن میں اس خیال کو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا بس سوچ سکتا تھا۔ پھر غالباً میں اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ سوال و جواب کر سکوں تو میں نے اپنی والدہ سے سوال کر ہی لیا کہ شاکرہ (بہن) کا انتقال کہاں ہوا تھا؟ تب میرے گمان کو یقین نصیب ہوا، جواب تھا کہ رحیم یار خان، کیونکہ تمہارے نانا کو وہاں بورنگ کرنے کا کوئی ٹھیکہ ملا تھا اس لئے کچھ عرصہ وہاں بھی رہنا ہوا تھا۔

میرے سگے نانا کا انتقال میری پیدائش سے قبل ہی ہو گیا تھا اس لئے میری والدہ کے چچا نے میری نانی اور ان کے بچوں کی کافی ذمہ داریاں سنبھال رکھی تھیں، وہ ہمارے خاندان میں سب سے پہلے فرد تھے جو جماعت اسلامی کے رکن بنے، بہت محبت کرنے والے اور پیار دینے والے انسان تھے، ان کی محبت اور شفقت کی وجہ سے ہمارے دل میں کبھی یہ خیال ہی نہیں آیا کہ ہمارے کوئی نانا نہیں۔

پانچ چھے سال تک کی عمر ایسی نہیں ہوتی جس میں یہ احساس ہو سکے کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے، کون کس جماعت سے وابستہ ہے، مسلک کیا چیز ہوتی ہے، غم کیا ہوتا ہے، سکھ کسے کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ایک مرتبہ صبح ہی صبح گھر میں عجیب قسم کی ہلچل سی مچ گئی۔ دروازے بجنا شروع ہوئے۔ بھاگم دوڑ لگ گئی، جب میری آنکھ کھلی تو گھر کے سارے ہی بڑے بیدار تھے، خواتین تو گھر میں نظر آئیں لیکن میرے ماموں کہیں دکھائی نہیں دیئے، چراغ روشن ہو چکے تھے۔ جس کو میں صبح خیال کر بیٹھا تھا وہ رات کا آخری پہر تھا۔ پھر بار بار دروازہ کھلتا اور بند ہوتا رہا، بھاری سامان رکھنے کی آوازیں آتیں اور معدوم ہو جاتیں۔ اس طرح یہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا۔ بچوں میں ہر بات کا تجسس کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے لہٰذا جب جب بھی میں نے اپنی والدہ سے ماجرا دریافت کرنا چاہا ''خاموش رہو'' کے علاوہ اور کوئی جواب نہیں پایا۔ بستر چھوڑ کر جانا چاہا تو بستر پر واپس لٹا دیا گیا، اسی کشمکش میں مجھے پھر نیند آ گئی اور اس طرح شب تمام ہوئی۔

صبح ہوئی تو رات کا واقعہ تحت الشعور سے شعور میں لوٹ آیا اور کسی سے پوچھے بغیر خود ہی گھر کا جائزہ لینے کی ٹھانی۔ ایک بڑے سارے کمرے میں بہت ساری کرسیاں، کچھ الماریاں، کچھ میزیں اور بیشمار رسائل، کتابیں اور لکھے ان لکھے کاغذات دیکھے۔ بات کچھ سمجھ میں آئی اور کچھ سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ سب کیا ہے؟ البتہ تجسس پایہ تسکین تک پہنچ گیا۔

گھر میں آپس میں سب لوگ بیٹھ کر جو باتیں کرتے اس سے اس

بات کا پتہ چلنے لگا کہ پاکستان میں کوئی گڑبڑ ضرور ہوئی ہے، لیکن کیا؟ شاید ابھی شعور اتنا پختہ نہیں ہوا تھا کہ اس بات کا ادراک ہو سکے۔ بڑی عمر میں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا تھا کہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صاحب نے مارشل لاء نافذ کیا تھا۔ اس وقت کے لوگ حکومت برطانیہ کا مارشل لا دیکھ چکے تھے اس لئے سیاسی دفاتر راتوں رات بند کر دیئے گئے تھے اور وہ سامان دراصل کتابوں، رسالوں اور فرنیچر کے ڈھیر تھے جو جماعت اسلامی کے دفتر کے تھے جس کو صبح ہونے سے قبل ہی بند کر دیا گیا تھا۔

گلی کے آخری سرے پر ایک خوانچے والا بیٹھا کرتا تھا جس کے پاس مجھ جیسے بچوں کے لئے کچھ مٹھائیاں اور کچھ نمکو قسم کی چیزیں ہوا کرتی تھیں اور میں اکثر کمرے میں رکھے ہوئے (اپنی سمجھ کے مطابق) بیکار کاغذات منتخب کرتا اور خوانچے والے کے پاس لے جاتا اور وہ کاغذات اس کے حوالے کر دیتا اور کچھ مٹھائیاں لے آتا۔ اس زمانے میں ''سنترے'' کے نام سے ایک ٹافی جیسی مٹھائی بہت مشہور تھی اور وہ مجھے بہت پسند تھی بس وہی ہر ایک دو دن بعد میں کچھ ''بیکار'' کاغذات منتخب کرتا اور ''سنترے'' کی مٹھائی لے آتا۔ ان زمانے میں بہت کم لوگ ہی پڑھے لکھے ہوتے تھے اس لئے خوانچے والے کو کیا خبر کہ میں اس کو کونسے اور کیسے ''بیکار'' کاغذات دے کر آتا ہوں وہ تو ایک دن میری شامت آنی تھی کہ میرے ماموں کے منہ میں بھی سنترے کی مٹھائی کی قاشیں دیکھ کر پانی آ گیا اور وہ اسی خوانچے والے سے کچھ سنترے چننے کے لئے جھکے ہی تھے کہ ان کی نظر ان ''بیکار'' کاغذات پر پڑی، ''بیکار کاغذات'' پر لکھی ہوئی عبارت پر نظر پڑتے ہی وہ زناٹے میں آ گئے کیونکہ وہ جماعت اسلامی کے کئی اقسام کے فارم تھے اور کچھ تقسیم کرنے والے ہینڈ بلز، پوچھا یہ آپ کے پاس کیسے؟ وہ میرے ماموں اور ہمارے سب گھر والوں کو پہچانتا تھا، میرا نام لے کر کہنے لگا یہ آپ کا بھانجا لا کر دیتا ہے اور مجھ سے سنترے والی مٹھائی لے جاتا ہے، بس پھر کیا تھا گھر میں میری خوب شامت آئی اور پٹائی بھی ہوئی، شاید اسی لئے وہ مار اور سنترے والی مٹھائی کا ذائقہ مجھے آج تک یاد ہے۔

مار تو پڑی لیکن ایک اچھی بات یہ بھی ہوئی کہ وہ کاغذات جو لا پر وائی کے ساتھ ایک کمرے میں پڑے ہوتے تھے سمیٹ کر سلیقے کے ساتھ الماریوں میں رکھ دیئے گئے

والد صاحب کئی برس سے کراچی گئے ہوئے تھے، جب ان کو پی آئی اے سے کچھ رخصت ملتی وہ ہم سے ملنے آ جایا کرتے تھے لیکن اس طرح پوری زندگی کہاں بسر ہو سکتی تھی، چنانچہ والد صاحب نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب ہم سب کو مستقل بنیادوں پر کراچی ہی بلا لیں گے اور اس طرح ۱۹۶۰ء میں ہم سب گھر والے کراچی آ گئے۔ میں بہاولپور سے پہلی جماعت پاس کر کے آیا تھا، اس وقت کے گورنمنٹ کے اسکولوں کی پڑھائی کا معیار اتنا اچھا تھا کہ مجھے کراچی میں ''جامعہ ملیہ'' جیسے اسکول میں ایک کڑے امتحان کے بعد بآسانی داخلہ مل گیا۔

حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے، زندگی میں بیشمار نشیب و فراز آتے ہیں، کسی کے ساتھ نشیب زیادہ ہوتے ہیں اور کسی کے ساتھ فراز۔ کچھ یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی کی زندگی میں نشیب ہی نشیب ہوتے ہیں اور کچھ فراز سے ہی سرفراز رہتے ہیں۔ ایسے خاندان جو ہجرت کے مراحل سے گزر رہے ہوں ان کے ساتھ ایسا ہو جانا کوئی انہونی بات نہیں۔

میں اپنے آپ کو ان خاندانوں میں شمار کرتا ہوں جن کو اللہ نے ہر قسم کی آزمائش سے گزارا۔ بہت اچھے دن بھی دیکھے اور بہت خراب اور سخت آزمائش والے ایام بھی لیکن میں نے اپنے سارے بڑوں کو بہت صابر اور شاکر پایا اور پھر یہی صابری اور شاکری اس وقت کے بچوں میں منتقل ہوئی۔

والد صاحب کی ریٹائرمنٹ ہو گئی، یہ اس بات کا شاخسانہ تھا کہ میری والدہ اور والد میں پورے بیس برس کا فرق تھا، ان کی ریٹائرمنٹ کے وقت میرے بڑے بھائی کی عمر بصد مشکل بیس برس کی ہو گی اس لئے ان کی پڑھائی تعطل کا شکار ہوئی اور انھیں ملازمت اختیار کرنی پڑی جس کی وجہ سے زندگی کا پہیہ چلنا سہل ہو گیا۔

اب میں آتا ہوں کہانی کے اس موڑ پر جہاں میں نے یہ کہا تھا کہ پاکستان میری پیدائش سے پانچ سال قبل ہی بن چکا تھا لیکن مجھے یہ جان کر سخت پریشانی اور حیرانی ہوتی تھی کہ میں نے پاکستان کو بنتے اپنی

آنکھوں سے کس طرح دیکھا؟ وہ مکانوں سے بلند ہوتے شعلے، وہ لوگوں کی چیخ و پکار، وہ کٹے ہوئے بازو اور گردنیں اور وہ سڑکوں اور گلیوں میں پڑے گلے سڑے لاشے اور بہتا ہوا لہو۔ میں نے یہ بھی ذکر کیا تھا کہ اکثر جب میں ان مناظر میں ڈوب جاتا تھا تو گھر ہو یا اسکول مجھے جھنجوڑا جاتا تھا اور سخت سرزنش بھی ہوتی تھی۔

میں سیکنڈری اسکول گوئنگ ہو چکا تھا۔ ایوب خان صاحب کے ''بی ڈی سسٹم'' کے الیکشن ہو چکے تھے، بی ڈی ممبران نے اپنی اپنی ذمہ داریوں کا آغاز کر دیا تھا، اتفاق سے ہمارے پڑوسی اسی سسٹم کے تحت چیئرمین (یا پتہ نہیں اس وقت کسی حلقے کے اہم عہدیدار کو کیا کہا جاتا تھا) کے عہدے پر فائز تھے، انھوں نے گلی کے آخری مکان میں ایک بہت اچھی لائبریری کھولی جس میں ہر ذوق کے حامل لوگوں کے لئے معیاری کتب میسر تھیں۔ میں بھی ایک دن اس لائبریری میں گیا۔ سب گھر والے بہت باذوق اور علم و ادب میں گہری دلچسپی رکھتے تھے اور فارغ اوقات میں کتابوں کا مطالعہ ضرور کرتے تھے اس لئے مجھے بھی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا، غالب، ذوق، میر، جوش، علامہ اقبال، بہادر شاہ ظفر جیسے شعرا میرے مطالعہ میں رہے، حفیظ جالندھری کا ''شاہ نامۂ اسلام'' تو مقدس کتابوں کی طرح گھر کے سبھی افراد پڑھا کرتے تھے اور بار بار پڑھا کرتے تھے، مسدس حالی، بال جبریل، بانگ درا، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز جیسی شاعری کی کتابیں مقدس کتابوں کی طرح پڑھی اور سنبھال کر رکھی جاتی تھیں۔

تاریخی ناولوں میں نسیم حجازی اور جاسوسی ناولوں میں ابن صفی کا مطالعہ میں اپنے چھٹپن میں ہی کرتا رہا تھا اس لئے چند قدم کے فاصلے پر کھلنے والی لائبریری کو میرے لئے کشش کا باعث بننا ہی بننا تھا۔

میں جب شیشوں سے جھلکتی کتابوں کے نام پڑھ رہا تھا تو میری نظر ایک رومانی ناول پر پڑی۔ ایک ناول کا نام پڑھ کر دل و دماغ میں بجلی سی کوندی۔ میں پورے یقین سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بچپن سے لیکر اپنے شعور میں آنے تک اپنے گھر یا باہر کبھی کسی کو نہ تو رومانی ناول پڑھتے دیکھا اور نہ کبھی کسی سے کسی رومانی ناول کا نام سنا لیکن..... یہ کیا..... ''چشمہ'' یہ ناول..... یہ نام..... نہیں نہیں یہ نام تو میرا سنا ہوا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ اس کو لکھنے والی کا کیا نام ہے..... کتاب بیتابی سے نکالی اور اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ میں ناول نگار کا نام جانتا ہوں ..... ہاں ہاں ..... بالکل ٹھیک..... رضیہ بٹ..... اف خدایا میں نے تو کبھی ''چشمہ'' کو نہیں پڑھا، ''رضیہ بٹ'' کا نام آج تک نہیں سنا ..... پھر یہ کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس ناول کی کہانی بھی مجھے معلوم ہوگی؟

یہی وہ تجسس تھا جس نے مجھے ایک چھوٹی عمر میں بھی اس ناول کو پڑھنے پر مجبور کیا اور پھر ایک اور ہی کہانی شروع ہوگئی۔ میں جس باب کو پڑھتا مجھے اس بات کا اختتام یاد آجاتا۔ میں پڑھتا گیا اور ہر باب کا انجام معلوم ہوتا گیا یہاں تک کہ اختتام سے قبل ہی مجھے ناول کی کہانی کا انجام معلوم ہو چکا تھا۔

اس ناول کو ختم کرنے میں مجھے کئی دن لگے لیکن یہ کئی دن مجھے ایک بار پھر اسی کیفیت میں لے گئے جس کا میں اپنی کمسنی میں شکار رہا کہ پاکستان میری آنکھوں کے سامنے کیسے بنا اور اب اس ناول کا ایک ایک لفظ مجھے ایسا کیوں لگا کہ اسے میں نے پڑھا ہوا ہے۔ یہ بات کیسے ممکن ہے کہ جو چیز آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہی نا ہو وہ دیکھی ہوئی لگے اور جس چیز کو آپ نے پڑھا ہی نہ ہو اس کا ایک ایک لفظ پڑھا ہوا لگے۔

اب کیونکہ میں نوجوانی میں داخل ہو چکا تھا اس لئے اس کیفیت میں بہت شدت سے تو نہیں گیا لیکن میرے دل کا یہ خلفشار بہر حال میرے لئے آزار جان تو بنا رہا لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا حل کہاں سے کھوجوں۔

اس کیفیت کو بھی کئی سال گزر گئے، ایک دن میں اندر سے پھٹ پڑا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اپنی والدہ کے آگے اپنے آپ کو کھولوں، شرم اور پاس ادب ہمیشہ میرے مانع آجاتا کہ کیسے ان کو یہ بتاؤں کہ آپ کا یہ نالائق بیٹا ایک رومانی ناول پر آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہے یا اپنے کسی مسئلے کو حل کرنا چاہتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس ناول

میں کوئی بہت زیادہ اخلاق باختہ بات تھی ہی نہیں لیکن یہ بات کہنا کہ میں نے کوئی رومانی ناول بھی پڑھا ہے ازخود ایک شرمندگی والی بات تھی اور وہ بھی بہت چھوٹی عمر میں، اس قسم کا کوئی تصور کم از کم ہمارے گھر میں موجود ہی نہیں تھا۔لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بس اب کچھ بھی ہو جائے، والدہ سے اس موضوع پر بات کرنا ہی ہوگی چنانچہ میں نے ان کو تنہا پا کر ان کے سامنے بصد شرمندگی دل کی الجھن رکھ ہی دی۔

امی! کیا ایسا ممکن ہے کہ جو کتاب کسی نے کبھی پڑھی ہی نہ ہو، جس مصنف یا مصنفہ کا نام آپ جانتے ہی نہ ہوں، جس ناول کا عنوان کبھی نظروں سے بھی نہ گزرا ہو اس ناول کے عنوان پر نظر پڑتے ہی آپ کا دماغ یہ چیخ پڑے یہ ناول آپ کا پڑھا ہوا ہے اور آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس کا خالق کون ہے اور پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس کی کہانی اور اس کا انجام کیا ہوگا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا ایک ایک لفظ چلا چلا کر یہ کہہ رہا ہو کہ ہاں ہاں تم نے مجھے پڑھا ہوا ہے۔

امی نے غور سے مجھے دیکھا اور کہا کہ تم کس ناول کی بات کر رہے ہو؟

میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا، چشمہ!

رضیہ بٹ کا لکھا ہوا تو نہیں؟، انھوں نے سوال کیا تو میں اور بھی زمین میں گڑ گیا، بدن پسینے پسینے ہو چکا تھا اور دل جیسے دھڑکنا بھولتا جا رہا تھا۔

کہاں پڑھ لیا؟ ایک اور سوال پوچھا گیا تو میں نے سارا ماجرا کہہ سنایا اور اس ناول کو پڑھنے کی اصل وجہ بھی بتا دی۔

والدہ تھوڑی دیر تو خاموش رہیں جیسے وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی ہوں کہ وہ کچھ کہیں یا نہ کہیں۔ پھر بولیں، میں خود حیران ہوں کہ کیا ایسا بھی ممکن ہے۔۔۔ یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہیں، پھر کہنے لگیں کہ جب تمہاری عمر شاید دو سال کی تھی تو سردیوں کی راتوں میں، میں اور تمہاری خالہ یہ ناول بلند آواز میں سنایا کرتے تھے، کبھی میں سناتی تو تمہاری خالہ سنتیں اور کبھی میں سنتی اور تمہاری خالہ اس کو بلند آواز میں سنایا کرتیں۔

پھر والدہ نے کہا، مجھے یہ بات بھی اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم بہاولپور میں تھے، وہ چراغ بتی کا زمانہ تھا، دن کی روشنی میں سارے کاموں سے فارغ ہو کر ہم لوگ سونے سے قبل بہت دیر تک باتیں کیا کرتے تھے۔ آگ اور خون کے دریا پار کر کے اس پار آئے تھے، وہ سارے مناظر جو پاکستان بننے اور اور بن جانے کے بعد ہماری آنکھوں نے دیکھے وہ دل و دماغ پر نقش ہو چکے تھے اور بھلائے نہیں بھلائے جاتے تھے تو ہم گھنٹوں ایک ایک منظر کو رو رو کر بیان کیا کرتے تھے اور ان برے دنوں کا ذکر کیا کرتے تھے۔

کہانی کے اس موڑ کے بعد میں نے ایک لفظ بھی ان سے مزید دریافت نہیں کیا۔ میرا ذہن اتنا ہلکا پھلکا ہو گیا کہ میں ان کے پیروں پر سر رکھ کر سو گیا، اٹھا تو میرا سر تکیہ پر تھا اور میرے بدن پر چادر پڑی ہوئی تھی۔

ہم بہت سارے کام اپنے بچوں کے سامنے بہت غیر محتاط ہو کر کر دیتے ہیں، یہ کہانی یہ سبق دیتی ہے کو بچہ خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو اس کے سامنے منہ سے نکلنے والا ایک ایک لفظ اور ہماری ایک ایک ادا اس کے دل و دماغ پر ثبت ہو رہی ہوتی ہے۔

☆.....☆.....☆

فرحت طاہر

تمہارے شہر کا موسم (۲)

ہم کہ بنے مسافر!

کراچی کے مرطوب موسم سے چل کر پنجاب تک پہنچنے کا قصہ، جہاں سردی ضرور تھی مگر اپنائیت کی گرمی کے ساتھ!

کہتے ہیں کہ جو چیز انسان دلچسپی سے پڑھتا ہے وہ لکھ بھی نسبتاً با آسانی سکتا ہے! پتہ نہیں یہ فارمولا کس حد تک درست ہے مگر اپنے لحاظ سے بالیقین کہہ سکتے ہیں کہ ہم سفر نامہ بڑے شوق سے پڑھتے ہیں لہذا روداد لکھ بھی خوشی سے لیتے ہیں۔سفر زندگی میں کم ہی کیے مگر جتنے بھی نصیب ہوئے ان کو رقم ضرور کیا۔حتیٰ کہ جن اسفار کی حسرت رہی ان کے بارے میں بھی ''سفر جو نہ ہو سکے!'' کے عنوان سے ایک تحریر لکھ رکھی ہے۔

پچھلے دنوں ہم نے سفر کیا تو حسب عادت اس کی روداد بھی لکھ بیٹھے۔اس پر کچھ اس طرح کی رائے سننے کو ملی کہ یہ تو دکھاوا ہے کہ جو نہ جا سکتے ہیں ان کے دل میں محرومی جنم لے گی اور حسد پیدا ہوگا۔۔۔! دوسری رائے یہ کہ اس قسم کے ہزاروں سفر روزانہ ہوتے ہیں کوئی انوکھی بات تو نہیں! ان منفی تبصروں نے ہمیں اپنا قلم روکنے پر مجبور کر دیا۔بالکل اسی طرح سے جیسے اپنے زمانہ طالبعلمی میں داخلہ مہم کی روداد ادھوری رہی تھی۔جی ہاں! اس مہم کے پہلے دن کی روداد لکھ کر جب ہم اپنے ساتھیوں کو دکھا رہے تھے تو میڈیکل کالج میں پڑھنے والی ایک ساتھی نے تمسخر اڑاتے ہوئے کہا کہ اس میں کیا دلچسپ بات ہوگی؟ لوگ آئے۔۔۔فارم لیا۔۔۔جمع کیا۔۔۔بس!۔۔۔اور ہم نے دل برداشتہ ہو کر اس کو وہیں روک دیا تھا! آج تیس سال پرانی ڈائری میں لکھی ادھوری روداد دیکھ کر خیال آیا کہ کہ اگر یہ مکمل ہوتی تو آج کے طالبعلموں کے لیے شاید کچھ رہنمائی یا دلچسپی کا باعث بنتی۔

۔پچھلے دنوں دس سال پرانی ڈائری میں لکھا بس کے سفر کا احوال سوشل میڈیا پر اپ لوڈ کیا تو اس کی پذیرائی پر احساس ہوا کہ اگر کوئی مدعا بیان کر دے تو لوگ خواہ خود نہ لکھ پائیں مگر اپنے دل کی بات پڑھنا پسند کرتے ہیں! تقویت ملی کہ ہم قاری کو کیوں محروم رکھیں؟ جو سفر نہیں کر سکتے وہ ہماری تحریر پڑھ کر تخیل میں سفر کر سکتے ہیں۔دوسری طرف ہزاروں لوگ سفر کرتے ہیں مگر اس کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔خود ہمارے حلقہ احباب میں ایسے افراد ہیں جو ہر سال امریکہ اور عمرے کا سفر کرتے ہیں لیکن موسم اور سفری مصائب بتانے کے علاوہ ایک جملہ نہیں لکھ سکتے تو پھر ہم کیوں اپنا قلم روکیں کہ احساسات کو رقم کرنا قلمکار کی مجبوری ٹھہری!

بس یہ سوچ کر سفر کی روداد مکمل کرنے کا فیصلہ کیا۔اور ویسے بھی مسافر کو منزل تک پہنچانا تو ضروری ہے نا!

ہماری اگلی منزل لاہور ہے! جہاں کئی دفعہ جانا ہوا مگر اسٹیشن یا ایر پورٹ سے اپنے مقام اور پھر واپسی! شہر گھومنے کی مہلت نہ مل سکی۔وہی لاہور جس کے بارے میں کہا جاتا ہے لہور لہور ہے! یا پھر جس نے لاہور نہیں دیکھا اس نے جنم ہی نہ لیا! مگر شاید یہ مقولے ہمارے لاہور کے میزبانوں نے نہیں سنے کیونکہ انہوں نے ہمارے اس پروگرام کو تنقید کی نگاہ سے دیکھا۔واقعی گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے۔بالکل اسی طرح ہم بھی کراچی آنے والوں کو سفاری پارک جاتا دیکھ کر ہمدردی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔خیر اس دفعہ ہم بطور خاص اسی مہم پر آئے ہیں یا لائے گئے ہیں بصد اصرار بچہ پارٹی!

۲۲ مارچ کو دوپہر ساڑھے بارہ بجے ہم پنڈی سے لاہور پہنچے تھے۔تھکن سے برا حال تھا۔سامان ہوٹل میں رکھنے کے بعد فریش ہوتے ہی کھانا لگ گیا۔حالانکہ صاف ستھرا بستر دعوت آرام دے رہا تھا مگر اس کی اجازت نہ تھی کہ دوران سفر کھانے کے مخصوص ہی اوقات ہوتے ہیں بالکل ہوسٹل کی طرح ورنہ۔۔۔۔۔!ابھی ہم کھانے کے

بعد نماز پر ہی تھے کہ عزیزہ نوشین کی آمد کا فون آ گیا۔ ہم اسے ہوٹل کی لوکیشن سمجھا ہی رہے تھے کہ وہ استقبالیہ پر پہنچ چکی تھیں ۔ وہاں موجود بچے نے انہیں پل بھر میں ہمارے دروازے پر پہنچا دیا۔ کیا ملن کی گھڑی تھی! اجنبی شہر میں کسی شناسا کی دید! مگر اجنبیت کیسی؟ تاریخ کے سفر میں یہ ہی تو وہ شہر تھا جہاں قرارداد پاکستان منظور ہوئی تھی۔ بچوں کا از حد اصرار تھا کہ ہم اس دفعہ ۲۳ مارچ مینار پاکستان میں منائیں گے۔ چنانچہ ہم اس جگہ موجود تھے۔

واہگہ اسٹیڈیم:

یہ وہ جگہ ہے جہاں پاکستان اور بھارت کی سرحدیں ملتی ہیں ۔ وہی سرحدیں جہاں دس لاکھ انسانوں کو نظریہ کی بنیاد پر تہ تیغ کیا گیا تھا۔ اب یہاں روزانہ دونوں ممالک کی پرچم کشائی کی تقریب ہوتی ہے ۔ ۲۳/ مارچ کو جانے کا پروگرام تھا مگر عزیزی میجر رازی کا مشورہ تھا کہ ۲۲ کو ہی چلے جائیں تو بہتر رہے گا چنانچہ ہم باوجود تھکن اور نیند کے گاڑی میں جا بیٹھے جو کافی پہلے سے ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ حماد ظہیر صاحب نے لکھا تھا کہ خواتین کو باتوں اور ملاقاتوں کے علاوہ کسی تفریح کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ بات تو سچ ہے مگر گھر والوں کو خواتین کو لے جائے بغیر بنتا بھی نہیں!

دو بجے کے بعد ہم واہگہ کی طرف رواں دواں تھے۔ راستے میں مدیرہ بتول کا فون آ رہا تھا مگر سگنل کے مسائل کی وجہ سے بات کرنا دوبھر تھا۔ خیر کسی طرح رابطہ ہوا تو یہ طے پایا کہ ہم واپسی پر ان سے ملاقات کریں گے کیونکہ صبح ان کی بیرون شہر روانگی ہے۔ ہمارے اس سوال پر کہ آپ رات گئے وقت نکال لیں گی؟ جواب ملا: آپ کے لیے تو نکالنا ہی ہے! بعض جملے بلکہ لہجے نہال کر دیتے ہیں! اللہ خوش رکھے صائمہ! بہر حال ہماری تھکاوٹ، نیند اور سب سے بڑھ کر ڈرائیور کے عدم تعاون نے ملاقات نہ ہونے دی جس کا افسوس رہے گا تا وقتیکہ ہماری ملاقات ہو سکے!

خوش گپیوں میں وقت کا پتہ بھی نہ چلا اور منزل پر پہنچ گئے مگر ٹھہریں۔۔۔۔ ابھی منزل مقصود کہاں! ابھی تو ہم وہاں پہنچے تھے جہاں گاڑی چھوڑنا تھی۔

داخلے سے پہلے اپنی حیثیت بتانی تھی۔ یعنی پروٹوکول والی یا عمومی۔ چونکہ ہم نے پورا سفر عوامی انداز میں کرنے کا طے کیا تھا اس لیے پروٹوکول کی سہولت نہ استعمال کی۔ بلاوجہ انسان قیدی سا محسوس ہوتا ہے ! خیر ہر دو صورتوں میں ابھی کافی مراحل تھے۔ چیک پوسٹوں سے گزرتے ہوئے، بیگز کی چیکنگ، جسمانی چیکنگ، اف۔۔۔۔۔ لگ رہا تھا بھارت میں ہی داخل ہو رہے ہیں! خواتین، بزرگوں، بچوں اور معذوروں کے لیے شٹل سروس تھی جبکہ مردوں، لڑکوں کو سارا سفر پیدل ہی طے کرنا تھا۔ ہمارے ساتھ ایک ہی مرد تھے انہوں نے اپنا کارڈ استعمال کرتے ہوئے وی آئی پی انکلوژر میں جگہ حاصل کر لی۔

بالآخر تمام مرحلوں سے گزر کر واہگہ اسٹیڈیم پہنچے اور اپنی نشستیں سنبھال لیں ۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیڈیم کھچا کھچ بھر گیا۔ موبائل سروس جام تھی گویا ہمارا رابطہ باہر کی دنیا سے کٹ چکا تھا بلکہ ہمیں اس کی حاجت بھی نہ تھی کہ اب تو جو کچھ تھا یہ ہی منظر اور پس منظر تھا! سامنے ازلی دشمن کی باڑ تھی ۔ وہاں بھی محفل سجی تھی مگر جذبوں کا فقدان نظر آ رہا تھا۔ جیسی گہما گہمی پاکستانی انکلوژر میں نظر آ رہی تھی یا ہمیں محسوس ہو رہی تھی وہاں نہ تھی۔ اگر ہوتی تو وہاں بیٹھے خواتین وحضرات ہم پر اتنی نظریں گاڑے نہ نظر آتے۔ محمد یوسف کو اپنے ابو کے پاس جانے کی ہڑک ہوئی جو عین ہماری نشستوں کے نیچے موجود تھے۔ قریب موجود رینجر کے نوجوان سے کہا مگر نظم وضبط کی ڈیوٹی پر مامور اس فرد نے صاف انکار کر دیا مگر تھوڑی دیر بعد مجمع سیٹل ہونے کے بعد ایک اور جوان نے اس کو اپنے ابو تک پہنچا دیا۔

اس وقت تقریب عروج پر تھی۔ ہماری طرف اذان گونجی ، تلاوت ہوئی اور جوش وجذبے سے معمور نعرے گونجنے لگے۔ جبکہ سرحد کے اس طرف ڈھول اور باجوں کی آواز ہی نمایاں تھی وہ بھی اذان کی پر سوز صدا میں ڈوب گئی تھی۔ نعروں کے جواب حاضرین پر جوش طریقے سے دے رہے تھے۔ نعرہ تکبیر اللہ اکبر اور پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ کی صدا دل میں اندر تک ٹھنڈک دے رہی تھی! دل چاہ رہا تھا کہ

اس کی گونج اکھنڈ بھارت کا خواب دیکھنے والوں تک پہنچے اور وہ دیکھ لیں کہ حلیہ خواہ کوئی بھی ہو نظریہ بہت گہری جڑیں رکھتا ہے ہم پاکستانیوں کے لیے! تقریب کے دوران بھارتی انکلوژر میں سے ایک لڑکی بھاگتی ہوئی پاکستانی سرزمین میں داخل ہوگئی۔ بھارتی حکام اس کو مارتے ہوئے واپس لے گئے۔ دیکھ کر دل بہت خراب ہوا۔ شاید اس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں تھا مگر ایسی بچی کو حساس علاقے میں اتنے آگے تک لانے کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آئی! تقریب کے دوران اور اختتام پر بھارتی خصوصاً سکھ ملحقہ باڑ کے ساتھ کھڑے ہو کر خیر سگالی کا پیغام دیتے رہے جس کا پاکستانی کوئی خاص نوٹس نہیں لے رہے تھے۔ یقیناً سب نے قیام پاکستان میں سکھوں کا کردار پڑھا ہوا ہے۔ ٹرین بھی رینگتی نظر آئی جی ہاں سمجھوتہ ٹرین!

تقریب کے اختتام پر پر جوش ہجوم یوں باہر نکلا گویا تحریک پاکستان میں حصہ لے کر لوٹا ہو! اسی جذبے کے ساتھ پاکستان کی تعمیر کی جائے تو حالات نہ بدلنے کا کوئی جواز نہیں! یہاں بھی میوزیم موجود ہے جسے ہم نے سرسری دیکھا۔ یہاں اداکار غلام محی الدین معہ فیملی موجود تھے جن کے ساتھ لوگ فرمائشی سیلفیز بنوا رہے تھے۔ واپسی کا سفر بھی ان ہی رکاوٹوں سے پر ہے! ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں تھیں جب ہم نے بھی واہگہ چھوڑا۔ ڈھیروں ڈھیر افراد کو جس مستعدی اور پھرتی سے رینجرز یہاں سے روانہ کر رہے تھے حیران کن تھا۔ اب یہ فوجی یہاں اکیلے کیا کریں گے؟ کسی بچے نے سوال کیا۔ ان کی تو ڈیوٹی ہے یہاں ! ساری رونق اور میلہ تو تھوڑی دیر کا ہوتا ہے۔ ویرانے میں خاموشی سی چھا گئی۔ ان کے مزاجوں میں درشتی اور سختی کی وجہ سمجھ آنے لگی تھی۔ ہمیں اس شہر میں اجنبی جان کر ڈرائیور نے فاصلوں کے ڈراوے سے ہمارے مرتب کردہ پروگرام کو لپیٹ دیا۔ ہوٹل پہنچ کر اندازہ ہوا کہ جسم کا ہر خلیہ تھکا ہوا ہے اور آرام کا طلبگار ہے۔ آنکھوں میں نیند لیے کھانا کھایا اور قصر ادا کر کے بستر پر گر گئے۔

۲۳/مارچ :

صبح آنکھ کھلی تو پتہ چلا کہ ہمارے موبائل کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ چکا ہے یعنی اس کی یادداشت غائب ہوگئی ہے۔ ہوا یوں کہ کل کسی وقت ہمیں واٹس اپ گروپ میں شامل کر لیا گیا جس کا ہمیں علم نہ تھا۔ اس کے نوٹیفکشن دھڑا دھڑ بجنے لگے اور نیند میں نہ جانے ہمارا ہاتھ کس بٹن پہ پڑا کہ سب کچھ غائب ہوگیا۔ کوفت کے مارے دوبارہ پروگرام انسٹال کیا مگر بیک اپ نہ مل سکا۔ اف! اس میں تو بہت قیمتی ڈیٹا تھا! سفر کی بہت سی روداد جس میں ہم نے معلومات قلم زد کرنے کے بجائے اسنیپ شاٹ لیے تھے کہ مروجہ طریقہ یہ ہی ہے ! اس وقت زیادہ افسوس ظاہر کرنے کا موقع اور مہلت نہ تھی کہ آج کا شیڈول اسی طرح سخت تھا جیسے ہم اسلام آباد میں گزار چکے ہیں گویا حج کے دنوں میں یوم النحر کی مانند! اس ہیبت میں بہت جلدی ہوٹل سے باہر آ کر کھڑے ہو گئے مگر گاڑی تو اپنے وقت پر ہی آئی۔ یہاں گرین بسوں کی طرز پر گرین رکشے اور گاڑیاں بھی چلتی ہیں۔ سب سے پہلی منزل تو مینار پاکستان ہے!

ڈرائیور نے ہمیں رکاوٹوں کے سامنے اتار دیا۔ ابھی سے؟ مینار پاکستان تو بہت دور ہے۔ معلوم ہوا کہ اورنج ٹرین کے باعث کھدائی ہو رہی ہے۔ دھول مٹی میں اٹا ہوا مینار پاکستان کہیں فاصلے پر تھا۔ ہم بادشاہی مسجد کی طرف چلے گئے۔ نماز کا وقت نہ ہونے کے باوجود مسجد آباد تھی تفریح اور زیارت کرنے والوں سے۔ مغلیہ دور کے اس شاہکار کی ہر اینٹ غفلت اور کوتاہی کا رونا روتی نظر آئی۔ قرآن گیلری دیکھی۔ مسجد میں دوگانہ ادا کر کے جھروکے میں بیٹھ کر تازہ ناریل کھائے۔ وہاں سے مینار پاکستان نظر آ رہا تھا۔ مختار مسعود کی آواز دوست کے اوراق یاد آ گئے۔ علامہ اقبال کا مزار تو عوام کے لیے بند تھا شاید کسی خاص شخصیت کے دورے کا پروٹوکول تھا۔ وہاں سے نکل کر شاہی قلعے کی طرف روانہ ہوئے۔

پرشکوہ اور پرجلال عمارتیں اور وسیع و عریض سیر گاہیں! اپنا الگ دفاعی نظام! مغلیہ دور سلطنت کی طرز زندگی اور رہائش کا اعلیٰ نمونہ نظر آتا ہے۔ شاہی زندگی کے کروفر نگاہوں میں گھوم گئے۔ معلوم ہوا کہ آج ۲۳/مارچ کی وجہ سے یہ عوام کے لیے کھولا گیا ہے ورنہ عموماً بند ہوتا ہے ۔ وجہ صاف ظاہر ہے! اس تاریخی اثاثے کی زبوں حالی اور کسمپرسی

رلا گئی۔ ڈرائیور کی بات درست لگی کہ ہر اس چیز پر توجہ ہے جس پر اپنا کتبہ لگا یا جا سکے۔ اب ان چار پانچ سو سال پرانی عمارات کو کون سنبھالے؟ حالانکہ انتظام اور مرمت و بحالی کر کے بھی اپنے نام کو تاریخ کے صفحات میں زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ تین چار ہزار سال پرانے شہروں کی کھدائی کر کے ٹوٹی پھوٹی مردہ اشیا تو اتنے کروفر سے سجائی جا رہی ہیں اور اپنے زندہ تاریخی نوادرات دیمک زدہ کیے جا رہے ہیں! وجہ یہ ہے کہ ان مردہ شہروں کی ذمہ داری تو اقوام متحدہ نے اٹھائی ہوئی ہے اور ہم اتنے نادان کہ اپنے اس ورثے کو بھلائے ہوئے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ یہاں موجود ہر عمارت کو متعلقہ علوم کے شعبے کے صدر دفتر کی حیثیت سے فروغ دیا جائے۔ تعلیمی اسناد کے لیے یہاں کا مطالعاتی دورہ ضروری ٹھہرے۔ تجویز دیے بغیر نہیں رہ سکتے مانے گا کون!

یہاں کے سبزہ زاروں میں پیڑوں کے سائے تلے بیٹھ کر ہم نے بھی اپنے آپ کو تصور میں مغلیہ دور کے پائیں باغ میں تفریح کرتے پایا مگر جوس کی ٹھنڈی بوتلیں اور ریپر میں لپٹے سنیکس اس منظر میں اجنبی سے لگے۔ قلعے سے باہر آئے تو لگا شاہی قلعے کی دنیا ایک الگ بستی ہے اور شاید اس دور میں بھی ہوگی۔ محمد یوسف نے قریب جا کر مینار پاکستان دیکھنے کی ضد کی اور منوں مٹی کھا کر واپس آیا۔

اب ہمارا رخ عجائب گھر کی طرف تھا۔ ابھی ہم نے گاڑی میں بیٹھ کر پاؤں پھیلائے ہی تھے کہ پہنچ بھی گئے۔ یہاں ہم نے لاہور کے بارے میں معلوماتی کتب خریدنے کی کوشش کی مگر قیمت سن کر چپ ہو گئے۔ وزن کون اٹھائے سفر میں اور پھر انٹرنیٹ پر تو سب کچھ موجود ہے ہی! فوراً دل کو بہلایا اور اندر داخل ہو گئے۔ یہاں تحریک آزادی اور اس کے حوالے سے نادر تصاویر اور اشیا دیکھنے کو ملیں۔ چونکہ بچے ابھی امتحان سے فارغ ہوئے تھے اور بہت سی باتیں ان کو تازہ تازہ یاد تھیں لہذا بہت اچھی طرح سمجھ میں آ رہی تھیں۔ مسلم لیگ کے اجلاس کے دوران استعمال ہونے والے چولہے، چائے دان، ٹائپ رائٹر اور دیگر اسٹیشنری بہت دلچسپی سے دیکھی گئیں۔ کاش جذبات، روایات اور اقدار بھی محفوظ رکھے جا سکتے۔۔۔ ان کے تحفظ کا بھی کوئی ادارہ ہوتا!

یہاں موجود کچھ چیزیں خون کا دباؤ بڑھا رہی ہیں مثلاً ملکہ برطانیہ کا مجسمہ! اس کے سر پر سجا تاج برسوں پرانی بات یاد دلا گیا۔۔۔۔ میں لندن جا کر ملکہ سے اپنا کوہ نور ہیرا واپس لے کر آؤں گی جو انگریز یہاں سے چرا کر لے گئے ہیں۔۔۔۔ ہم نے فضہ کو ٹٹولا۔۔۔ اب اسے اتنی عقل آ گئی ہے کہ اپنی چیز واپس لینے کا ایک ہی طریقہ ہے۔۔۔ علمی اور تہذیبی فتح! ویسے پچھلے ماہ اس حوالے سے پیش رفت یہ ہوئی ہے کہ لاہور ہائی کورٹ نے ہیرے کی واپسی کے لیے مقدمہ کی منظوری دے دی ہے کہ یہ پنجاب کا ثقافتی ورثہ ہے اور ملکہ برطانیہ کو کوئی قانونی حق نہیں کہ وہ اس ہیرے کو اپنے تاج میں سجائے۔ دیکھیں اس مقدمہ کا کیا بنتا ہے!

یہاں سے نکل کر باغ جناح المعروف لارنس گارڈن گئے۔ گارڈن میں ڈھیروں ڈھیروں خاندان پکنک منا رہے تھے ہم بھی ان میں شامل ہو گئے۔ کھانا کھایا۔ تھوڑا آرام کیا اور اب ایک نئی منزل کی طرف۔ جی ہاں! بہت فرمائشی جگہ یعنی چڑیا گھر۔ ہم نے یہاں سے بچنے کی بہت کوشش کی مگر بچے بضد تھے۔ سڑک پر ٹریفک اور عوام کا ازدہام بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ہم نے سوچا ہمارے پاس تو وقت کم ہے اس لیے آج کے دن نکلے مگر معلوم ہوا کہ یہاں چھٹی کے دن تفریح منانے کا رجحان اور رواج ہے۔

مگر افسوسناک بات یہ کہ تقریباتی اور تفریحی کلچر کی شوقین عوام کے سامنے اس دن کی اہمیت واضح نہیں ہے کیونکہ کوئی ایک تقریب بھی اس حوالے سے نہیں نظر آئی۔ نظریہ پاکستان پر ویسے ہی دھول ڈالنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ کاش میلوں ٹھیلوں کی شوقین قوم کو مقصد حیات سے آگاہ کر دے کوئی!

عوام جانوروں کے پنجروں کے آگے جوق در جوق کھڑے تھے۔ سب سے زیادہ ہاتھی اور شیر پر رش تھا۔ سانپ گھر کے باہر لمبی لائن! ہم نے جانے سے انکار کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ لوگ بھی سانپوں کو دیکھے بغیر واپس آ گئے۔

ہمارے بہنوئی بچپن اور نوعمری کا زمانہ یہاں گزار چکے ہیں لہذا بہت جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اب انہوں نے گاڑی ماڈل

ٹاؤن کی طرف مڑ والی جہاں ان کا مکان اور ماضی کی رہائش گاہ تھی۔ وہاں پہنچ کر گھر کے موجودہ مکینوں سے ملاقات کی۔ بچے بضد تھے کہ گھر کی چھت پر چڑھ کر پاگل خانہ کی عمارت دیکھی جائے جیسا کہ ان کے ابو اپنے بچپن میں دیکھا کرتے تھے۔ اس نامعقول فرمائش کو پورا کرنا بعید از قیاس تھا کہ اب نہ وہ نظر ہے نہ نظارہ! بہر حال یہاں کا پر سکون اور خوبصورت ماحول دیکھ کر بچوں سمیت ڈرائیور بھی کہہ اٹھا کہ یہ جگہ چھوڑ کر کیوں گئے۔۔۔۔ اور ان کی خاموشی کہہ رہی تھی کہ تیس برس پہلے ہم فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں کہاں تھے!

اب ہمارا بلکہ گاڑی کا رخ ریس کورس گراؤنڈ کی طرف تھا۔ یہاں سالانہ ثقافتی نمائش لگی ہوئی تھی۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بے انتہا رش تھا۔ اب تو ویسے بھی شام ڈھل رہی تھی۔ تفریح کا باقاعدہ وقت تھا۔ ایک طرف مختلف اشیا کے اسٹالز لگے ہوئے تھے تو دوسری طرف اسٹیج پر پھکڑ بازی ہو رہی تھی۔ ہم پہلے ہی اسٹال پر شاپنگ میں مصروف ہو گئے جس سے روکنے کے لیے ہمیں بہت بہلاوا دینے کی کوشش کی گئی کہ ابھی تو بہت بڑا پارک ہے مگر ہم اس بھرّے میں نہ آئے اور ایک ہی اسٹال پر ٹک گئے۔ شاپنگ کی پیاس تو کیا بجھتی، ''ساغر و مینا مرے آگے'' کے مصداق ابھی حلق بھی تر نہ ہوا تھا کہ اندھیرا اور تھکن کے باعث واپسی کی راہ لی مگر مصمم ارادہ ہے کہ کل یہیں سے آغاز کریں گے۔ رات کو پنجاب کا خاص روایتی کھانا مزے لے کر کھایا۔

صبح ناشتے کے بعد پلیٹ فارم کا ٹکٹ لے کر وہاں موجود نیشنل بک فاؤنڈیشن کے اسٹال میں گھس گئے۔ منتظم کے خشک رویے کے باوجود دو ہزار کی کتب خرید لیں مگر آپ یہ سمجھیں کہ ان کی اصل قیمت کہیں زیادہ ہے کیونکہ خاصی نادر کتب ہیں جو اور کہیں دستیاب نہ ہو سکتی ہیں۔ ان کو ہوٹل میں رکھ کر شاپنگ کے لیے بازار گئے مگر آدھا دن گزرنے کے باوجود ہنوز بند تھے لہذا نامراد واپس ہوئے۔ گرمی کے باعث تفریح کے لیے بھی شام کو نکلنے کا پروگرام بنایا۔ آج لاہور میں گرمی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا ہے۔

پارک جانے کے لیے شام کا وقت طے کیا۔ باغوں کے شہر لاہور میں پھولوں کی نمائش بھی دیکھی۔ شمسی لائٹ سے روشن ہوتے کھمبے بڑے بھلے لگے۔ میلہ کی رونق اپنے عروج پر تھی۔ پارک کے سامنے ہاسپٹل دیکھ کر ذہن میں آیا کہ خدانخواستہ حادثے کی صورت میں۔۔۔۔۔! (فوراً الاحول پڑھی تھی مگر انہونی ہو کر رہی اور ہم دھک سے رہ گئے جب کراچی پہنچتے ہی گلشن پارک میں بم دھماکے کی خبر ملی۔ بہت سے لوگ جو ہماری واپسی سے لاعلم تھے فون پر ہماری خیریت معلوم کرتے رہے) بچوں اور نوجوانوں کو پانی میں کھیلتا دیکھ کر اپنا سمندر یاد آ گیا۔

رات کو پارٹی میں گئے جہاں سے واپسی اس وقت ہوئی جیسا کہ کراچی کی تقریبات سے ہوتی ہے۔ کراچی والے اپنے ہی ٹائم کے مطابق زندگی گزارتے ہیں خواہ برسوں کہیں اور گزار لیں!

واپس ہوٹل آ کر پیکنگ مکمل کی کہ کل واپسی کا سفر ہے۔ ہم بھی تھک چکے تھے اور کراچی والے شاید ہماری کمی محسوس کرنے لگے تھے۔ اپنی قدر گھر سے دور جا کر ہی ہوتی ہے! ویسے یہ جملہ معترضہ ہے کیونکہ موبائل فون کے ذریعے رابطہ ہمہ وقت ہی رہا اور اپنے شہر سے باخبر تو ہم پورے سفر میں رہے۔ خواہ پرویز مشرف کے ملک سے فرار کی خبر ہو یا مصطفٰی کمال کی نوزائیدہ پارٹی کے نام رکھنے کی تقریب! ویسے یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ ہمارے حلیے یا لہجے میں کیا بات ہے کہ جس سے بات کرو یہ ہی پوچھتا ہے کراچی سے آئے ہیں؟ اور اگلا سوال کراچی کے حالات کے حوالے سے ہوتا ہے جو خاصا مضمحل کر دیتا ہے بالکل ایسے جیسے کسی بچے سے اس کے گھر ہونے والی چپقلشوں کا حال پوچھ لے کوئی۔۔۔ بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی!

اگلے دن بیس گھنٹے کے سفر کے بعد ڈرگ روڈ اسٹیشن پر اترے تو چلچلاتی گرمی میں مری یاد آ گیا۔ طویل راشد منہاس روڈ کے دونوں طرف آباد بستیوں کو دیکھا اور چن چی گاڑیوں کو دیکھ کر آنکھیں بھیگ گئیں۔ کیا قسمت پائی ہے ہمارے شہر نے! پانچ بلند و بالا پلوں سے گزر کر جب ہم اپنی منزل پر پہنچے تو لگا اتنی مسافت میں تو دوسرا شہر آ جاتا۔ شہر اپنا ہی اچھا لگے خواہ بدنام ہی ہو، کتنا ہی بے ہنگم کیوں نہ ہو جو یہاں ایک بار آ جائے اس کے سحر سے نہیں نکل پاتا تو ہم جو یہاں کے دائمی باشندے ہیں کس طرح اس سے بے رخی برت سکتے ہیں!

سلسلۂ روز شب

کراچی، ڈھاکہ، کینیڈا

محترم خرم مراد جب مشرقی پاکستان میں تھے تو ۱۹۶۸ میں ان کی چھوٹی بہن شیما سعدیہ (مقیم کراچی) کی شادی ڈھاکہ کے ایک معزز خاندان کے نوجوان سید مشید حسین ہمایوں سے ہوئی۔ اجنبی زبان اجنبی معاشرت کوئی رشتہ نہ تعلق سوائے دینی اور تحریکی رشتہ کے والدہ نے اسی کی بنیاد بناتے ہوئے یہ رشتہ طے کیا۔ شیما نے خود لکھا کہ میری سہیلیاں کہتی تھیں تمہاری اماں کو کیا ہو گیا ہے۔ رخصتی بھی کراچی میں نہ ہوئی۔ میاں بیوی کی پہلی گفتگو جاتے ہوئے جہاز میں ہوئی۔ شروع میں ہی سقوط ڈھاکہ کا حادثہ پیش آیا اور پھر انہوں نے ڈھاکہ میں زندگی گزاری ۱۹۹۴ء میں ہمایوں کا انتقال ہو گیا۔ خرم بھائی کا سہارا بھی نہ رہا۔ انہوں نے یہ زندگی کیسے گزاری؟ عام لحاظ سے بھی اور تحریکی حوالے سے بھی یہ ایک دلچسپ موضوع ہے اپنے بھائی مسلم سجاد صاحب کے کہنے پر انہوں نے اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ وہ کوئی مصنفہ نہیں ہیں۔ یادداشتیں ہیں اور بے ساختہ انداز ہے شیما بہن کے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ وہ خود اب پرنانی بن چکی ہیں۔ دو سال قبل بڑے بیٹے کے پاس کینیڈا منتقل ہو چکی ہیں۔ امید ہے کہ ان کے حالات سے آگہی ہمارے قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگی۔ (ادارہ)

لکھنا تو شروع کیا ہے۔ باقاعدہ رائٹر نہیں ہوں۔ یہ بھی خیال آتا ہے کہ دماغ کو زنگ لگ چکا ہے۔ اسکول کے زمانے میں بھائیوں کے پیچھے لگ کر انگلش اردو کے مضامین لکھوایا کرتی تھی۔ گزشتہ سال جب میں اپنی بیٹی مزنہ کے گھر برمنگھم گئی تو مسلم بھائی نے کہا: ایک بات کہتا ہوں، ہنسنا مت، بلکہ سنجیدگی سے سوچو۔ اپنے بارے میں لکھو (خودنوشت) نمونتاً کچھ مضمون لکھ کر بھیجے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کیا اس طرح؟

پسند کرنے کے ساتھ، مزید لکھنے کی تاکید آ گئی۔ کیا اتفاق کہ وہاں مزنہ کی بیٹی میمونہ سے میری بڑی دوستی رہی۔ بہت سمجھ دار، چھوٹی، مگر بڑوں والی سمجھ۔ کہنے لگی: نانی مجھے رائٹر بننا ہے۔ میں سوچتی رہ گئی اور اپنے اوپر شرم بھی آئی۔ اتنی سی بچی کا یہ شوق۔ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ پھر جب میں نے اس کی کاپیاں دیکھیں تو ٹیچرز کے بڑے اچھے تبصرے دیکھ کر دل بڑا خوش ہوا۔ میں نے کہا: میمونہ! یہ سب احتیاط سے رکھو۔ بڑے ہو کر دیکھنا۔ چھوٹی سی بچی اتنی موٹی موٹی کتابیں پڑھتی نظر آتی ہے اور ایک بات یہ کہ لکھنے میں تکلف۔ یوں بھی خیال آتا ہے کہ اردو میرے لئے مشکل بھی ہو گئی ہے۔ خط لکھنے کے سلسلے میں بھی خیال آتا رہا کہ اردو خراب ہو چکی ہے۔ یہ اندازہ مجھے ہے۔ خطوط کا زمانہ گیا، ٹیلی فون، موبائل اور کمپیوٹر کے دن آ گئے۔ (خیر، ہم آثار قدیمہ کے لوگوں نے اس میں بھی مہارت حاصل نہ کی)

بنگال آئے مجھے ۴۳ سال ہو گئے۔ بنگلہ ہی بولنا آسان لگنے لگا ہے۔ البتہ، لکھنا بالکل نہیں آتی، ہاں کام چلانے کے لائق پڑھ لیتی ہوں۔ شروع میں تو راستے کے بورڈ بھی سمجھ نہ آتے تھے۔ تب اپنے اوپر بڑا افسوس ہوتا تھا۔ باقاعدہ بنگلہ بہت شروع میں سیکھ لینا چاہیے تھی۔ اماں کا برابر اصرار تھا۔ اپنی سستی اور لاپروائی ہی وجہ ہے۔ ساجد بھائی (ماموں زاد) ڈھاکہ آئے، تو کہنے لگے، اخبار پڑھے بغیر تم کیسے رہتی ہو؟ وہ شاید چھوٹے بچوں کے ساتھ اتنا مصروف وقت تھا کہ مہلت نہ تھی۔ بھاگتے دوڑتے کام پورے ہوتے تھے۔ پھر پاکستان سے تعلق ہونے کی وجہ سے اردو میں پڑھنے کو کچھ نہ کچھ ملتا ہی تھا۔ شادی کے تحائف میں بنگلہ سیکھنے کی بہت سی کتابیں تھیں مگر نالائقوں کی بھلا کیا دوا۔ سسرالی رشتہ داروں میں ایک بڑی پیاری سی لڑکی نے (جو اس وقت میٹرک کی طالبہ ہوگی، حسن آرا نام، تعلیم کی بہت شوقین، بنگلہ دیش پھر

امریکہ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں، ڈھاکہ میں پروفیسر ہوئی۔ بالآخر انڈیا طالبات کے ساتھ گئی اور حادثے کا شکار ہوئی)اپنے ذوق وشوق سے مجھے بنگلہ سکھانے کا بیڑا اٹھایا۔ بنگلہ کے حروف تہجی سکھا دیئے۔ الحمدللہ، اس سے بڑی مدد ملی۔ جوڑ جوڑ کر بہت کچھ پڑھ لیا جاتا ہے۔ اپنے چھوٹے دو بچوں کو میں نے ہی سکھائے۔خبروں کی تفصیل تو بنگلہ اخباروں میں ملتی ہے۔انگلش کا ہی اخبار لیتے ہیں، اردو کو ترستی ہوں۔ سب سے جلدی اردو ہی پڑھی جاسکتی ہے۔

شہدائے بنگلہ

بنگلہ دیش میں تو بنگالی زبان کی جیسے پوجا کی جاتی ہے۔آزادی کے بعد جب قائداعظم نے مشرقی پاکستان کا دورہ کیا تھا اور جلسہ عام میں کہا تھا: کہ اردو صرف اردو پاکستان کی قومی زبان ہوگی۔جلسہ عام میں اس پر کوئی احتجاج نہ ہوا پھر جب جامعہ ڈھاکہ کے کرزن ہال میں کنونشن میں دوبارہ یہ بات کہی گئی urdu should be the state-language of pakistan تو سامعین کی طرف سے NO,NO کا شور اٹھا۔وزیراعظم ہوکر لیاقت علی خاں جب آئے تو انہوں نے بھی یہ بات کہی۔ یہ ابتدا تھی، اختلاف کا بیج اسی وقت پڑ گیا۔ بگاڑ کا نقطہ آغاز تھا، باقاعدہ موومنٹ شروع ہوگئی۔یہی چیز آگے بڑھتی چلی گئی۔۲۱ فروری ۱۹۵۲ء کو جلوس پر پولیس کی طرف سے گولی چلی، جو مرے شہید کہلائے جانے لگے۔ جہاں پر یہ مرے وہاں ایک یادگار بنائی گئی، جو شہید مینار کہلاتی ہے۔سارے بنگلہ دیش میں جگہ جگہ یہ شہید مینار مختلف سائزوں کے ہیں۔

بہرحال ۲۱ فروری شہدائے زبان کا دن ہے۔بڑے زبردست طریقے سے ہر سال منایا جاتا ہے۔ مجھے تو عید کی طرح کا ایک تہوار لگتا ہے۔ وہی لال پیلی ساڑھیاں، نئے نئے کپڑے پہنے، سب کا رخ انہی شہید مینار کی طرف ہوتا ہے۔۲۱ فروری کو عام تعطیل ہوتی ہے۔ کئی دن پہلے سے ٹی وی پر پروگرام شروع ہو جاتے ہیں۔یکم فروری سے بنگلہ اکیڈمی میں کتابوں کا بڑا میلہ ہوگا۔صرف یہاں نہیں، بلکہ اسٹیڈیم بیت المکرم کے آس پاس بھی ہوتا ہے۔ یہاں ایک دوبار میرا بھی جانا ہوا۔ ہر سال ہی ۲۱ فروری کو ٹارگٹ کر کے نئی نئی کتابیں آتی ہیں۔

در اصل سارے ملک میں ہی یہ میلے ہوتے ہیں اور اب تو Unesco نے ۲۷ نومبر ۱۹۹۹ء سے ۲۱ فروری کو بین الاقوامی مادری زبان کے دن کے حساب سے مانا اور ۲۰۰۰ء سے دنیا کے مختلف ممالک میں ان پر پروگرام شروع ہو گئے۔پھر ۲۰۰۸ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے رسمی طور پر اسے تسلیم کر لیا۔دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی قوم ہو جس نے زبان کی محبت وعزت کی خاطر ایسی قربانی دی ہو۔پھر تو امریکہ، کینیڈا، سڈنی، بارسیلونا، لندن، انڈیا، ٹوکیو، فلپائن اور پتہ نہیں کہاں کہاں شہید مینار بنے۔

نیا سال

پھر بنگلہ سال کا پہلا مہینہ آیا۔ بیساکھ، ناچ گانے خوشیاں..... سڑکوں پر بڑی رونق ٹی وی کے پروگرام، نئے نئے اچھے اچھے کپڑے پہنے لوگ۔ بازاروں میں اسی لحاظ سے کپڑے آجاتے ہیں۔ایسے ثواب کے موقع بھلا کون چھوڑے۔غلطی یا ضروری کام سے ایسے دن گھر سے باہر نکلنا ہوجائے تو تماشے اور نظر آتے ہیں۔ ہندوؤں کی نقل تو یہاں بہت ہوتی ہے۔شروع شروع میں بہت زیادہ محسوس ہوتا تھا۔معاشرے پر بڑے اثرات ہیں۔ ہر جگہ ہی ہندوانی چھاپ، ہندو ہیں بھی بہت۔ پھر ۳۱ دسمبر آتا ہے۔مخصوص علاقوں میں کرسمس بھی منا لیتے ہیں، کچھ ہندوؤں کی نقل، کچھ انگریزوں کی نقل، شاید ماحول کی کچھ عادت ہی ہوگئی۔

تبلیغی اجتماع

تبلیغی جماعت کے یہاں بہت اثرات ہیں۔ کہتے ہیں حج کے بعد یہ دوسرا بڑا مجمع ہوتا ہے۔ساری دنیا سے لوگ آتے ہیں پھر سارے بنگلہ دیش سے، دیہاتوں سے لوگ امڈ پڑتے ہیں۔لانچ، بس، ریل اور پیدل۔تصور غالباً یہ ہے کہ شرکت سے پچھلے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ مناجات والے دن تو دوکان، بازار اور مارکیٹیں سب بند ہوتے ہیں حکومت کے بڑے بڑے عہدہ دار پہنچتے ہیں۔اس بار تو غالباً تعداد کی زیادتی کی وجہ سے دو دن کیا گیا۔

پاکستان آمد

میرا تعلق پاکستان سے تھا،لیکن انسان جہاں رہے اور جس ماحول میں رچ بس جائے ، ویسا ہی ہو جاتا ہے ۔شاید میرے ساتھ یہی ہوا۔ مجھے اب یہ ماحول اور یہ لوگ ہی اچھے لگتے ہیں ۔اگر نہ لگتے تو شاید رہنا مشکل ہوتا۔اچھے برے لوگ تو سب جگہ ہی ہوتے ہیں۔

میری اماں یو پی (میرٹھ) اور ابا مظفر نگر کے تھے ۔تقسیم کے وقت ہم لوگ بھوپال میں رہتے تھے ۔کچھ عرصے بعد پاکستان آ گئے ۔اس وقت بہت چھوٹی تھی اس لئے کوئی خاص باتیں یاد نہیں ۔پھر ہم لوگ گاندھی گارڈن کے قریب ایک گھر میں کرایہ پر آ گئے تھے ۔پھر پیر الٰہی بخشش کالونی میں آئے ،جس کے بارے میں مولانا مودودی نے ایک بار کہا تھا کہ یہاں کراچی کے پڑھے لکھے لوگوں کا نچوڑ نسبتاً زیادہ ہے۔

یہ ہمارا اپنا گھر تھا۔اس گھر سے میری بہت یادیں وابستہ ہیں ۔ لیاری کی سوکھی ندی کے قریب یہ گھر تھا (جس میں بارش میں پانی آتا تھا) بڑی محبت اس گھر سے محسوس ہوتی ہے ۔کالونی کے ڈھائی پلاٹ پر بنا ہوا یہ گھر بقول میری بڑی بہن کے ہوسٹل لگتا ہے ۔بڑا سا صحن ، تین طرف برآمدے ، سب کے الگ الگ چھوٹے چھوٹے کمرے ۔ پھر بھائیوں کی شادیوں کے بعد تبدیلیاں آتی رہیں ۔ بھائی بھی انجینئر ، ابا بھی انجینئر ۔ایسی تبدیلیاں کہ گزارہ ہو جائے ۔آج کل تو مشترکہ خاندان کم ہو رہے ہیں مگر اس وقت ساتھ رہنا اچھا سمجھا جاتا تھا اور اچھا لگتا بھی تھا، شاید اس لئے کہ اس وقت دلوں میں رشتوں کی قدر و منزلت زندہ تھی۔

۱۸ سال اس گھر میں رہنا ہوا۔ یہاں سے رخصتی ہوئی ۔ابا کے ساتھ ہمارے دو بہن بھائی (فضل احمد سعید اور زبیدہ خاتون) اماں کو شادی پر ملے تھے ۔ذکر سنا کرتی تھی ۔بہن کو تو دیکھا بھی نہیں ۔عمروں کا تفاوت ، وہ سب سے بڑی اور میں سب سے چھوٹی ۔ان کے دو بچے ہمارے بہن بھائیوں کے برابر ۔ان لوگوں سے دوستی تھی ۔ہاں بھائی کو پہلی بار ۱۹۵۵ء میں دیکھا جب بھوپال جانا ہوا۔ بہت تعلق رکھتے تھے ۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد بہت بلاتے رہے جب پاکستان سے ہم کٹے ہوئے تھے۔

آپا اور بی بی

اپنی دو بڑی بہنوں (نفیسہ ،نویدہ) کی شادیوں کا مجھے کوئی علم نہیں ،جن کو ہم آپا اور بی بی کہتے تھے ۔جب ہوش سنبھالا تو گھر میں نہ دیکھا ۔تعریفیں سننے کو ملتی رہتی تھیں ۔اس وقت تو یہ تعریفیں اچھی نہ لگتی تھیں ۔اس عمر میں پہنچ کر اب سوچتی ہوں کہ اماں سے دور ہو گئی تھیں اس لئے زیادہ خیال آتا ہوگا ،اس لئے ذکر کرتی رہتی ہوں گی ۔لیکن اب یہ خیال بھی آتا ہے کہ تعریف صحیح کرتی تھیں ۔دونوں ہی اپنی جگہ بے مثال تھیں مخصوص خوبیوں کے ساتھ۔

مختصر وقت کے لئے آپا پنجاب سے آیا کرتی تھیں ۔ چھوٹے بچوں کے ساتھ بہت مزا آتا تھا۔ بہت خوشی ہوتی تھی ۔خط لکھنا میں نے آپا سے ہی سیکھا اور بہت سی باتیں ان کے ساتھ کرتی رہتی کہ شاید خود ہی اس کی تربیت ہو جائے ۔ بنگلہ دیش بننے اور اماں کے انتقال کے آٹھ سال بعد جب میں کراچی گئی تو ان کو ماں کے روپ میں دیکھا ۔چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال ، بہت باتوں میں میری رائے کو اہمیت دیتی تھیں ۔ ٹانگ کی ہڈی ٹوٹی ۔ پھر کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہوئیں ۔ بے انتہا صبر کے ساتھ وقت گزارا۔اگر کوئی قریب سے نہ دیکھے ،اندازہ نہیں کر سکتا۔ وفات سے دو دن پہلے میں پہنچی کوئی خاص بات نہ ہو سکی ۔ ہمیشہ ڈھاکہ جانے سے پہلے کہا کرتی تھیں ’’تمہارے جانے کا وقت ہو گیا۔ٹھیک سے بات نہ ہو سکی ۔‘‘ ہمیشہ بہت موٹا معمولی سادہ لباس اور چپل جبکہ دوسروں کے لئے دل و جان سے کرنا اور کروانا۔کس طرح دوسروں کے مسائل حل کئے جائیں ۔ضرورتیں پوری کی جائیں ، بس زندگی کا بڑا مقصد خدمت خلق تھا۔بہن بھائی کیا اور سسرال والے کیا ،سب ہی حسن سلوک کے گواہ ہوں گے ۔ان کے کردار و اخلاق کا عکس ان کی اولاد میں نظر آتا ہے ۔اللہ مغفرت کرے ۔ ہمارے یہ بہنوئی پابند صلوٰۃ نہ تھے ۔ آپا سے نظریاتی اختلاف بھی تھا۔زندگی گزر گئی ۔لیکن بقول میرے ایک بھائی ، وہ کہتے تھے ،تم لوگ نماز ، روزوں کے حساب کتاب کروا رہے ہو گے اور ہم جنت میں بیٹھے تماشہ دیکھ رہے ہوں گے ۔اس لئے کہ خدمت

آگے بڑھ کر کرتے تھے۔نوے فیصد رحم اللہ کے پاس ہے والی حدیث کا خیال آجاتا ہے۔اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کیسے کیسے معاف کرے گا کیا معلوم! دوسری بہن (نویدہ) آپا اور اماں شاید دونوں ہی انہیں بی بی کہتے تھے۔اماں کا یہ جملہ مجھے خوب یاد ہے کہ بی بی بڑے صبر والی ہے۔کچھ اتفاقات ایسے ہوئے کہ زیادہ ساتھ رہا۔ہم لوگ جب پاکستان آئے، وہ انڈیا میں تھیں۔ ہمارے دو بھائیوں کی شادیوں میں وہ وہاں موجود تھیں۔جب ۱۹۵۵ء میں بھوپال گئی تھی تو ان کے گھر سیہور جانا رہنا یاد ہے۔پھر غالباً ۵۹، ۱۹۶۰ء میں وہ کراچی آ گئی تھیں۔لمبا عرصہ ساتھ رہنا ہوا۔ان کی بیٹیاں نادرہ، عارفہ میری ہم عمر تھیں۔ بڑی نادرہ سے دوستی رہی۔کالج بھی ایک تھا۔ پھر اس کا ڈاکٹر نثار احمد سے شادی کے بعد ڈھاکہ آنا اور رہنا ہوا۔بنگلہ دیش کے قیام کے بعد وہ پہلی آنے والی تھی۔ اس لئے وہ مناظر یاد آتے ہیں۔بی بی کا یہ جملہ یاد آتا ہے کہ نادرہ تم سے ملے گی۔اسی لئے اس کے بچے رکھنے پر ہم تیار ہو گئے۔اماں کے بعد جب میں کراچی گئی تو آپا اور بی بی کا انداز بہت زیادہ مشفقانہ لگتا تھا۔اس کے بعد جب بھی کراچی جاتی رہی، بہت زیادہ خیال رکھتیں۔ بڑے اچھے اور باقاعدہ خط آتے تھے۔سب سے تعلق رکھنے والا انداز تھا۔

ہم آٹھ بہن بھائیوں کی شادیاں اسی کالونی کے گھر سے ہوئیں، بغیر کسی رسم ورواج کے۔نہ بیوٹی پارلر نہ شادی ہال کا چکر، نہ مہندی، نہ تصویریں کھچ رہی ہیں، نہ ویڈیو ہو رہا ہے۔اماں کہتیں تھیں: تحفوں کا مسئلہ بھی ہلکا کرنا چاہیے۔کسی پر اس کا بوجھ نہ ہو۔

شادی ہو کر ڈھاکہ آئی تو پتہ چلا کہ بنگال میں تحفے تحائف کا خوب رواج ہے۔اپنا ہو نہ ہو دینا ضروری، غریب سے غریب آدمی بھی اس کو ضروری سمجھتا ہے۔پھر بدلے میں ملتے ہیں..... ہماری شادی کے وقت اتنے تحفے تھے کہ ڈیڑھ دن تحفے دیکھنے میں لگ گیا۔یہاں شادی اور دیگر تقریبات میں گھر گھر جا کر دعوت دینے کا بھی عام رواج ہے۔ یقیناً یہ عزت افزائی کا ایک طریقہ ہے۔یہاں اتنا عام تھا اور ضروری تھا کہ لوگ اس کے بغیر دعوت ہی قبول نہ کرتے تھے۔میرے لئے یہ بہت عجیب تھا اب ٹریفک کے مسائل کی وجہ سے لوگ ذرا ٹھنڈے پڑے ہیں۔مجھے تو یہ وقت کا ضیاع ہی لگتا تھا اور ہے۔میں نے بھی یہ کام کیے ہیں۔میرے بچوں کے تو میری نندوں دیور اور دیورانی نے کیے۔میں کہتی تھی کارڈ دے رہے ہیں یہی بڑی بات ہے۔

بچپن کی سیریں

آپا کے ہاں لائل پور (فیصل آباد) گوجرہ، صادق آباد اور ملتان جانا ہوا۔انصر (ڈاکٹر انصر پرویز) فرخ سیر (سی اے) کے ساتھ کھیلنے میں مزا آتا تھا۔اسلم بھائی کھیتوں میں گھمانے بھی لے جاتے تھے۔ گو بھی کے کھیت وہاں ہی دیکھے تھے۔پھر اماں ابا کے ساتھ بھوپال کا چکر ہوا، ریل سے۔چار جگہ ریل بدلی۔وہ بھی بڑا مزے کا سفر تھا۔ ہندوؤں کے اسٹیشن رتلام پر ایک رات بھی گزارنی پڑی تھی۔پھر بھوپال پہنچے۔اماں نے مصروف ترین وقت گزارا۔خرم بھائی کی بری دن رات ایک کر کے تیار ہوئی۔جب انڈیا میں کپڑا اچھا اور سستا ہوتا تھا شاید۔ ہونے والی سسرال میں دعوتیں کھائیں، خوب مزا آیا۔منصب منزل بڑا بہترین سا گھر تھا۔قریب ہی وہ پانی تھا جہاں تعزیے ڈبوئے جاتے تھے۔اس لئے وہ کربلا روڈ تھی۔

ابا ملازمت کے سلسلے میں شروع شروع میں پنجاب کے دوروں پر رہا کرتے تھے۔جب آتے، اپنے پاس سلاتے تھے۔چھوٹوں کو بہت پیار مل جاتا ہے مگر شاید اس وقت احساس نہیں ہوتا۔ابا کی ملازمت ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن میں تھی۔ مجھے اکثر آفس لے جاتے تھے۔چھت پر کھیلنے کی جگہ تھی۔

میری اماں

سر میں سرسوں کا تیل بڑا زبردستی لگتا تھا۔مجھے اچھا نہیں لگتا تھا، اور ایک چوٹی! اور مجھے دو اچھی لگتی تھیں۔اب ان سب باتوں کی بڑی قدر آتی ہے۔اماں کے تعلق کا انداز مختلف (جس کا اظہار نہ ہوتا تھا) محبت بھی خیال بھی، اور تربیت بھی، کبھی ڈانٹ نہیں پڑی۔کبھی کوئی سخت بات سننے کو نہ ملی۔اگر کسی بات پر نہیں ہو جائے، بس وہی ڈانٹ لگتی تھی۔

بھابیوں کی کوئی غلطی انہیں کبھی نظر نہ آتی تھی۔میرے کچھ کہنے سے ہی کہتی تھیں، سوچو تو، ہم دوسروں کے گھروں سے لڑکیاں لاتے ہیں

اور ہماری لڑکیاں بھی تو کہیں جائیں گی۔ اور پھر مجھے بھی ان کی اس بات کا بڑا فائدہ ہوا۔ میرے کان بھرنے کو تو میری کام والیاں ہی کافی ہیں۔ جب میں کچھ نہیں بولتی تو وہ لوگ کہتی ہیں لگتا ہے آپ بہو ہیں اور وہ ساس ۔ حقیقتاً یہ رشتہ بڑا نازک ہے۔ خوفِ خدا اور کسی کے ساتھ زیادتی نہ کرنے کا احساس ہی سیدھے راستے پر رکھتا ہے۔ یا پھر یہ سوچنا کہ کوئی ہمارے ساتھ ایسا کرے یا کہے تو ہمیں کیسا لگے گا؟ اماں کا نقطہ نظر تو یہ تھا کہ اگر ان کا بیٹا آرام سے ہے تو انہیں کوئی شکایت نہیں۔

میں ضد کر کے اماں سے بہت باتیں منوالیا کرتی تھی۔ اب اپنے اوپر رکھ کر سوچتی ہوں تو لگتا ہے وہ زندگی کے اس حصے میں تھیں جب انسان کمزور ہو جاتا ہے۔ میں نے شاید ان کا بڑھاپا ہی دیکھا۔ ممتاز (خاندانی ملازم) کہتا تھا، بیا کی ایک آواز پر سارے بچے جمع ہو جاتے تھے۔ سب ڈرتے ہوں گے، یہ بات پتہ نہیں کہاں تک صحیح ہے۔ شاید میں نہیں ڈرتی تھی۔ میرے میاں کا کہنا بھی تھا کہ تم اماں سے اس طرح باتیں کر لیتی ہو freely اور بقول قاسم بھائی، اماں کی ڈانٹ نہ پڑنے کی وجہ سے میں بگڑ گئی..... میری دوستوں کے ہاں بھی اماں مجھے لے کر جاتی تھیں۔ کہیں کہیں سارا دن بھی گزارا۔ ایک پروفیسر کے ہاں بھی، میرے اصرار پر۔ یہ نہیں کہ اعتماد اور اعتبار نہ تھا بلکہ کالج میں لڑکیوں کا حال دیکھ کر عجیب لگتا تھا۔ گھر سے اجازت نامے لکھوائے جاتے تھے۔ کہیں کالج سے ٹور پر جانا ہے یا پکنک پر۔ میں تو جیسے اس سے بے نیاز تھی، کہیں جاؤں نہ جاؤں میری مرضی۔ شاید اتنا بھروسہ ہوگا کہ خراب کام میں نہیں کروں گی یا خراب جگہ نہ جاؤں گی۔ بس صرف خبر دینا ہی کافی تھا۔

ہر فن مولا تھیں، یہی کہنا شاید ٹھیک ہوگا۔ بازار کا کام ہو، یا گھر کا کھانا پکانا ہو، یا سلائی کڑھائی سلمہ ستارہ ٹکنا ہو، یا لحاف میں روئی ڈال کر نگندے ڈالنا ہوں۔ قمیص بشرٹ سلنا ہو یا شلواروں میں ڈورے ڈالنا ہو، ان کو کرتے دیکھ کر ہر عام آسان ہی لگتا تھا۔ مجھ سے ہاتھ سے دو کرتے سلوائے تھے اس وقت تو مصیبت ہی لگے تھے، زبردستی جیسے اور آج کل تو میں دیکھتی ہوں کہ لڑکیوں کے پاس نہ سیکھنے کا وقت ہوتا ہے اور نہ ماؤں کے پاس سکھانے کا۔ بس ڈگری حاصل کرنے کی دھن سوار ہوتی ہے۔ پڑھائیاں بڑھ گئی ہیں۔ پھر شادی ہو کر دوسرا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ بہر حال اب یہ لگتا ہے اور بھی کچھ سیکھا جا سکتا تھا۔ وہ دو کرتے سینے کا مجھے بڑا ہی فائدہ ہوا۔ یہاں میں نے بہت سیے، اپنے میاں کے، بچوں کے، نندوں کے بچوں کے، کچھ ستاروں کا کام اور کچھ دھاگے کا کام۔ اپنی بڑی بیٹی کا جہیز میں نے تیار کیا، خود ہی تعجب ہوتا ہے، پتہ نہیں کیسے! اماں دیکھتیں تو ان کو کتنے نقص نظر آتے۔ خیر اندھوں میں کانا راجا، پھر دل لگا کر بہت سلائیاں کی۔ باورچی خانے میں پکاتے وقت میرا ایک شوق ناول پڑھنا تھا جو غالباً اماں کو پسند نہ تھا۔ برداشت کرتی تھیں۔ طرح طرح سمجھانا، اتنے گھنٹے اگر ایک اچھی کتاب پڑھو تو فائدہ ہو۔ پھر چھپا چھپا کر بھی پڑھتے (کالج کے سامنے لائبریری سے لیتے ایک آنہ روز کرایہ دینا ہوتا تھا) کتاب کے اندر رکھ کر یا تکیہ کے نیچے رکھ دیا۔ انٹر میں آ کر تقریباً چھوڑ دیئے۔ میں اس کو اپنی تفریح سمجھ لیتی تھی اور اب بھی مزا تو آتا ہے، ڈھاکہ میں ہونے کی وجہ سے ترسنا پڑتا ہے۔ کہتی تھیں کچھ دیکھو سیکھو پھر مجھے ہی برا کہو گی۔ الحمدللہ اس کی نوبت نہ آئی کھانے پکانے میں بہت وقت لگانے کے خلاف تھیں۔ ہاں جب جمعیت والوں کی افطار پارٹیاں ہوتیں تو پھر ڈھیروں کٹلیٹ بنانا پڑتے تھے۔ جوش و خروش سے تیاریاں ہوتی تھیں، خود بھی ہاتھ بٹاتی تھیں۔

اسکول میں داخلے سے پہلے مجھے اور اسامہ کو ابا حساب کرایا کرتے تھے۔ انگلش اردو فارسی کی ایک کلاس آگے تک تیاری اماں نے کرائی تھی۔ عربی کی گردانیں یاد کروائیں جو بہت کام آئیں۔ کہتی تھیں قرآن زیادہ سے زیادہ پڑھو، عربی آجائے گی۔ ایک آیت کو بار بار پڑھو، دیکھو، کیسا مزا آتا ہے۔ خود گھنٹوں قرآن پڑھا کرتی تھیں۔ جب گھبراہٹ ہوتی تھی اور اب تعجب بھی ہوتا ہے اور رشک بھی آتا ہے۔ ہمارا دل تو اس طرح نہیں لگتا۔ یکسوئی نہیں ہوتی۔ امام ابن تیمیہ پر بہت کچھ بتایا کرتی تھیں اس لئے میں نے، ان کو زیادہ پڑھا۔ قاسم بھائی نے غالباً اپنا تھیسس ابن تیمیہ پر لکھا۔ شاید ان کے پسندیدہ فلاسفر تھے۔ ہو سکتا ہے اسی وجہ سے اپنی پوتی کا نام تیمیہ رکھ دیا۔ اس میں کبھی کبھی اماں کی جھلک آجاتی ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ کے کچھ حصے روح پر مجھے سمجھائے۔

ایم اے کے کورس میں یہ حصہ تھا۔ پھر بڑی محنت سے ٹیوٹوریل تیار کروایا۔ اماں کے خطوں کا بڑا ذخیرہ تھا جو ۱۹۷۱ء میں ضائع کرنا پڑا کہا کرتی تھیں ''تم کسی سے خطوں کی امیدیں نہ لگاؤ۔ میں ہر تیسرے دن تمہیں خط لکھوں گی۔''

یہ تو انسانی فطرت ہے۔ جو چیز ہاتھ سے چلی جائے اپنی دسترس میں نہ رہے، اس کی بڑی قدر آتی ہے۔ روزمرہ ہی اس کا مشاہدہ ہوتا ہے تو خیال آتا ہی ہے کہ بہت کچھ ان سے سیکھنے کا تھا جو نہ سیکھا، لیکن الحمدللہ جتنی قربت ملی، خود دیکھا اس سے بھی میرے خیال میں بہت فائدے ہوئے۔ میں اپنے تجربات بچوں کو بہت بتاتی رہتی ہوں۔ اصل میں بچپن کی تعلیمات ذہن نشین ہو جاتی ہیں، اس لئے اماں کا ذکر بہت آتا رہتا ہے۔ اگر میرا حافظہ اچھا ہوتا تو بہت قصے یاد ہوتے جو اماں سنایا کرتی تھیں۔

ہماری ایک خالہ تھیں جن کا ذکر اماں سے سننے کو ملتا تھا۔ خالو کا ذکر بہت دکھ سے سناتی تھیں جو لاپتہ ہو گئے تھے۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں اختر آپا اور بانو آپا۔ اختر آپا ہمارے گھر آ کر رہا کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے گڑیا بھی بنا کر دی تھی۔ میں بندر روڈ (اب ایم اے جناح روڈ) ان کے گھر سے تعزیے دیکھنے جاتی تھی، وہاں سے نظر آتے تھے۔ کیا اتفاق کہ اتنے زمانوں کے بعد اب کے عاشورہ کراچی میں گزارا۔ لگ رہا تھا، پاکستان ایران سے بڑھ کر اہل تشیع کا ملک ہے۔ عجب صورت حال تھی۔ دو دن تو جیسے ایک دوسرے سے رابطہ بھی ممکن نہ تھا۔ دہشت گردی کے خوف سے پورا ملک تلپٹ ہو کر رہا تھا اور اب کسی کو کہیں تعزیے دیکھنے جانے کی ضرورت نہیں۔ ٹی وی پر ہر چیز ہر منٹ پر بڑی تفصیل سے دکھائی جا رہی تھی۔

رخصتی کے وقت ڈھاکہ آنے سے ایک دن پہلے شام کو اماں بہت افسردہ بیٹھی سمجھاتی رہیں کہ وہی لوگ اب تمہارے اپنے ہیں، ہم تمہیں جلدی بلائیں گے۔ سب سے زیادہ اثر انہی پر ہوگا مگر انتہائی پرسکون، گھر سے نکلتے وقت میرے قریب نہیں آئیں۔ مامی نے رخصت کیا۔ شادی کے دو ماہ بعد میرا ایک چکر کراچی کا ہوا۔ پھر میرے بڑے بیٹے سعد اور خرم بھائی کی چھوٹی فائزہ کی پیدائش پر اماں کا دو ماہ کا قیام ڈھاکہ میں رہا۔ قیام کے دوران ہر طرح کی خدمتیں کرتی رہیں۔ کس کس بات کو یاد کروں۔ ان کا ڈھاکہ سے روانگی کا دن میرے لئے بڑا تکلیف دہ تھا۔ بہت دن اثر رہا پھر ۱۹۷۰ء میں رافع کی پیدائش کے سلسلے میں جب میں کراچی آئی تھی، بس اس دنیا میں وہی میری آخری ملاقات تھی۔ ہر طرح سے ہر بات کا خیال کرنا، آرام پہنچانا، کیا نہیں کیا۔ غیر معمولی صفات کی مالک تھیں۔ ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔ بہوؤں کے لئے بھی اسی طرح مصروف رہا کرتی تھیں۔ ہسپتال کی بھاگ دوڑ۔

سوچتی ہوں، ان کی صفات کا تھوڑا سا حصہ بھی مجھے مل جاتا تو میں بھی اچھی ہو سکتی تھی۔ چستی اور پھرتی، ہر کام کے لئے تیار..... اپنی لڑکیوں سے میں کہتی ہوں، تم لوگ بدقسمت ہی ہو، ایسی ماں ملی۔ مزنہ سے میں نے کہہ دیا تھا (وہ برمنگھم میں ہوتی ہے) تم کبھی یہ نہ سوچنا کہ میں بچوں کی پیدائشوں کے سلسلے میں تمہارے گھر آؤں گی۔ مگر کیا اتفاق کہ چار بچوں کے بعد جب دو ایک ساتھ کی خبر آئی تو شور مچ گیا۔ ہر طرف سے کہا گیا۔ بس پھر جانا ہو گیا۔ شعیب اور احمد نانی کو لے آئے۔ وہاں تو زندگی کا انداز ہی دوسرا ہے۔ دو دن بعد ہی سارے کاموں میں لگ گئی۔ مسز نظامی نے مجھے کہا آپ لڑکیوں کو کیسے چھوڑ دیتی ہیں۔ میری نند کہتی تھی، تم کیسی ماں ہو۔ میں دل ہی دل میں سوچتی تھی، اس سے ہی تو سسرال والے خوش ہوتے ہیں۔

بنگال میں بیٹیوں کے گھر جا کر رہنے کا عام رواج ہے۔ کیونکہ وہ ساسوں پر بھروسہ کرنے کے قائل نہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں تو یہ تصور تھا اور یہ کہ بیٹیوں کے گھر جا کر رہنا اچھی بات نہیں ہے۔ مائیں بیٹیوں کے گھریلو معاملات میں جتنا کم دخل دیں، اتنا ہی اچھا اور بہتر ہے۔ میری اماں نے بھی شاید احسان جتا کر ہی کہا ہوگا یہ پہلی بار ہے کہ میں کسی لڑکی کی سسرال میں رہی، حالانکہ باقاعدہ تو نہ رہیں، مستقل خرم بھائی کے ہاں جاتی رہیں۔

ہمارا خالص تحریکی گھرانہ تھا۔ آج کل بچے پیدا ہو کر ٹی وی موبائل اور کمپیوٹر دیکھتے ہیں۔ ہم نے ہوش سنبھالا تو جمعیت جماعت

اجتماعات اٹھنا بیٹھنا اور اوڑھنا بچھونا یہی تھا۔ بڑوں کے ساتھ اجتماعات میں جانے کا شوق، اتنا کچھ سمجھ میں بھی نہ آتا تھا اس وقت مگر یہ خراب لگتا تھا کہ کھانے پینے کو کچھ نہیں ملتا تھا۔ کھانے پینے کی جگہوں پر جیسے تالے پڑے ہوتے ہیں۔ میں سوچتی تھی ان لوگوں کا کھانے پینے سے مطلب نہیں، مگر اب یہ چیز کچھ رائج ہوگئی ہے۔ پھر محلے کی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو جمع کر کے میں نے خود بھی سکھانا شروع کر دیا۔ اس زمانے میں طلعت (طلعت سلطان، اکنا، امریکہ ہمارے پڑوسی۔ ان کی بہن صفیہ سے بہت دوستی تھی۔ پھر محبوب صاحب (سابق ناظم اعلیٰ پڑوسی) کی بہنیں، یہ سب ساتھی تھیں۔ محلے میں میری بہت دوست تھیں، دائیں بائیں آگے پیچھے۔ پھر غریبوں کی جھونپڑیوں میں بھی پہنچ جاتی تھی۔ دھوبن بھی سوکھی ندی میں گھر بنا کے رہتی تھی۔ چوکیدار اور زینب کا گھر، ممتاز کا پختہ گھر تھا۔ زبردست آزادی کے دن تھے۔ اماں جیسے خبر نہیں رکھتی تھیں، کہاں ہوں کیا کر رہی ہوں۔ شاید اس زمانے میں لوگ اچھے تھے۔ بہر حال اس وقت بنگلہ دیش میں تو لگتا تھا لڑکی بڑی ہوئی، اب حفاظت کرو۔

اجتماع میں سلطان احمد صاحب اور ام زبیر صاحبہ کے ہاں بہت زیادہ جانا ہوتا تھا۔ اماں اجتماعات میں بہت کم بلکہ نہ جانے کے برابر ہی جاتی تھیں۔ بیگم مودودی ہمارے گھر آئیں تو درس قرآن کا پروگرام رکھا گیا۔ حمیدہ بیگم کے اماں سے اچھے تعلقات تھے۔ وہ ہمارے گھر آتی تھیں۔ میں بھی لاہور ان کے گھر ایک بار گئی تھی۔ پھر ایک بڑے درس قرآن کا پروگرام مامی کے گھر ہوا تھا۔ وہ بیگم مودودی کا ہی درس تھا۔ اماں نے رشتہ داروں میں میدان ہموار کر رکھے تھے۔ ہر ماہ اعانت کی رقم جمع کرنا، بغل میں کتابیں ہوتی تھیں۔ بس یہی مقصد، یہی لگن۔ اچھا خاصا جہاد ہی ہے۔ بہر حال اس وقت مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ مجھے سمجھاتی تھیں میں اپنے لیے تو نہیں کر رہی۔ کوئی زیادہ پیسے دے دے، تو بے حد خوش ہوتی تھیں۔ ساری اعانت اسامہ صاحب کے پاس جمع ہوتی تھی۔ نئے نئے لوگوں سے بات کرنا، پیغام پہنچانا مشکل لگتا ہے۔ جانے پہچانے لوگ ہوں تو پھر ٹھیک ہے۔ پیسوں کا کام تو اور بھی مشکل ہے۔ چندے کی طرح کوئی دو چار روپیہ دیتا تو انہیں سخت تکلیف ہوتی۔ ڈھاکہ خطوں میں بھی اس کا ذکر کرتی تھیں۔

پیر کالونی میں ڈاکٹر فراست کا میٹرنٹی ہوم اماں کا خصوصی سینٹر تھا۔ جا جا کر وہاں بیٹھتی تھیں۔ وہاں بہت کتابیں لے جاتی تھیں۔ ڈاکٹرنی سے خوب تعلقات تھے۔ ہماری نئی نسل کی ایک بڑی تعداد وہیں پیدا ہوئی۔

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

بات ہے اقدار کی!

کوئی خوشی کا موقع ہے، آپ ان عزیز کے ہاں مبارک باد دینے کے لئے جانا چاہ رہے ہیں جنہوں نے حال ہی میں گھر کسی دوسری جگہ منتقل کرلیا ہے۔ آپ فون پر گھر سمجھنا چاہتے ہیں جو گفتگو ہوئی ہے وہ کچھ یوں ہے۔

''میں نورانی کباب ہاؤس کے سامنے موجود ہوں۔ جی اچھا تو اب ایسا کیجئے کہ بائیں ہاتھ پر دو گلیاں چھوڑ دیں اب آپ کے دائیں ہاتھ پر محفوظ شیر مال ہے۔ دوسری جانب ڈنکن ڈونٹ ہے۔ وہاں سے تیسری گلی کے باہر آپ کو آغا جوس سینٹر کا بورڈ نظر آئیگا بس دائیں ہاتھ پر تیسرا گھر ہمارا ہے۔''

فرض کیجئے عیادت کے لئے آپ کو سابق مالک مکان کے گھر جانا ہو جو کسی دوسری آبادی میں منتقل ہو گئے ہیں۔ آپ صراطِ مستقیم کی دعا کے بعد انکا گھر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ اسی آبادی میں کہیں بھٹک رہے ہیں وہ سوال کرتے ہیں آپ کہاں ہیں؟ آپ فرماتے ہیں۔ جی حضور میں اس وقت بلوچستان سبجی کے سامنے کھڑا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں ڈبل روڈ پر آپکے بائیں پیزا پوائنٹ ہے۔ وہاں سے کچھ آگے کارنر پر آپ کو حاجی رمضان پکوان سینٹر نظر آئے گا۔ وہاں سے مڑ کر چوڑی سڑک پر آجائیں اب آپ کے لیفٹ پر آپ کو میکڈونلڈ پڑے گا اور رائٹ پر دہلی چٹخارہ ہاؤس۔ آپ سیدھا ناگوری ملک والی گلی میں داخل ہو جایئے۔ تین بٹا تیرہ آپ کو دروازے پر لکھا ہوا نظر آئے گا۔

آپ کو کسی کا نیا گھر سمجھنے یا پہلی مرتبہ کسی کے ہاں جانے پر اسی طرح کی نشانیاں سننے کو ملتی ہیں مثلاً شاہین شنواری سے سیدھے آجائیں۔ اسٹوڈنٹ بریانی سے الٹے ہاتھ پر مڑ جائیں۔ سوغاتِ شیریں سے سروس روڈ پر آجائیں۔ کے ایف سی سے آگے آجائیں کوئٹہ ہوٹل سے چورنگی کی طرف مڑ جائیں، کبابستان سے آگے چوک پر آجائیں۔ برگر کنگ یا ڈسکو بیکری پر کسی سے معلوم کرلیں وغیرہ وغیرہ۔ آپ سروے کی غرض سے نہ بھی گھر سے نکلیں اور اپنے دائیں بائیں نظر دوڑائیں بالخصوص رات کے اوقات میں تو ایک ہی ہنگامے پر موقوف ہوتی ہے سارے شہر کی رونق.....جگہ جگہ چوک چوراہوں پر سجے دسترخوان، پوش علاقوں میں ہوٹلوں کے باہر آپ کو اتنا رش نظر آئے گا کہ کسی تقریب کا گمان ہوگا۔ پہلے شرفا چھپ چھپا کر ٹھیلے پر کھڑے ہو کر کچھ کھاتے ہونگے اور مارے خوف کے دائیں بائیں دیکھتے جاتے ہونگے کہ کوئی شناسا یوں دیکھ نہ لے۔ مگر اب تو چلتی مصروف شاہراہوں، بازاروں کے اطراف لوگ لب سڑک پیٹ پوجا میں مصروف ہوتے ہیں۔ اشتہا انگیز خوشبوؤں نے راہ چلنے والوں کا راہ چلنا دوبھر کر دیا ہوتا ہے۔ ہر بڑی آبادی میں ساتھ میں خالی پلاٹس ہوتے ہیں اکثر وہاں خانہ بدوش یا ماسیاں وغیرہ ڈیرے ڈالے ہوتے ہیں۔ وہ بچے اور جوان انہی سڑکوں پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ صاحب و بیگمات اس سے بے خبر ہوتے ہیں کہ ہم اس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں جس میں پھل کھا کر پھلوں کے چھلکے باہر پھینکنے کو منع فرمایا گیا ہے کہ مبادا تمہارا پڑوسی تنگ دست ہو اور اس کے بچوں میں ان پھلوں کے چھلکوں سے احساسِ محرومی پیدا ہو جائے۔

چلیں یہ تو گھر کے باہر کے معاملات ہیں یہاں تک گھر کے اندر تک کے معاملات میں حساسیت ہے کہ ایسا کھانا پکا ہے گھر میں کہ لامحالہ خوشبو پڑوس کے گھر تک گئی ہوگی۔ دیکھو بی بی شوربہ ذرا پتلا کر لینا اور پڑوسی کی خبر لے لینا کہ ایسا نہ ہو کہ ان کے گھر میں فاقہ ہو یا معمولی کھانا میسر ہو اور خوامخواہ تمہاری ہانڈی کی خوشبو انہیں دکھی کر دے یا کسی احساس کمتری میں مبتلا کر دے۔

جو دین اتنا حساس ہو دوسروں کے جذبات و احساسات کے معاملے میں اس کے ماننے والے خلقِ خدا کی طرف سے سنگ دل ہو سکتے ہیں نہ بے نیاز..... یہاں تو باورچی خانہ جو خالصتاً پرائیویٹ معاملہ ہے اس کے بارے میں دین اتنا حساس ہے ہم تو چوک چوراہوں پر اشتہا انگیز خوشبوؤں سے لطف اٹھاتے سوچتے بھی نہیں کہ معاشرے میں احساس محرومی کتنا بڑھ رہا ہے۔ شہر میں جو اسٹریٹ کرائمز بڑھ رہے ہیں کبھی کوئی تجزیہ نگار تجزیہ کرے کہ اس میں ان فوڈ سینٹرز اور فوڈ اسٹریٹ کا کتنا ہاتھ ہے۔

ہمارے گلی محلوں کی پہچان ہی بریانی، نہاری، حلیم اور ریسٹورنٹ بن گئے۔ کیا اچھا ہو کہ آپ کسی سے اس کے گھر کا پتہ پوچھیں اور وہ کچھ یوں گویا ہو کہ محترم! آپ اقبال اکیڈمی سے سیدھے کتابستان کی طرف تشریف لائیں آپ کے دائیں ہاتھ پر قرطبہ مسجد پڑے گی وہیں مڑ جائیں آپ کے سامنے غالب لائبریری ہوگی وہاں نہیں جانا آپ مکتبہ دارالاندلس والی روڈ لیں اور غزالی ایونیو پر نکل آئیں۔ آپ کے سیدھے ہاتھ پر اسکالرز اکیڈمی پڑے گی اور الٹی جانب ہاؤس آف وزڈم۔ وہاں کسی سے جامعہ صفہ کا معلوم کرلیں، وہیں جامی چوک سے سیدھے آجائیں اور الٹے ہاتھ پر بخاری اسٹریٹ سے اندر داخل ہوں۔ گلی کے باہر دانش کدہ کا بڑا سا بورڈ نظر آئے گا۔ الٹے ہاتھ پر تیسرا گھر میرا ہے۔ گھر کی پیشانی پر تختی لگی ہے جس پر ایمان، اتحاد اور تنظیم کے حروف کندہ ہیں۔ بس وہی میرا غریب خانہ ہے۔

دل دہل جاتا ہے یہ سوچ کر کہ کہیں مورخ ہمارا ذکر یوں نہ کرے کہ لاالٰہ کی دعویدار اک امت شکم پرستی میں گرفتار تھی۔ اس کے دل و دماغ کا مسکن اسکا شکم بن گیا تھا۔

آیئے ''ذائقہ'' بدلنے کے لئے سلیم احمد کی بزم میں چلتے ہیں۔ دیکھیں وہ قدروں کے بدلنے کو کس نظر سے دیکھ رہے ہیں۔

بن کے دنیا کا تماشہ معتبر ہو جائیں گے
سب کو ہنستا دیکھ کر ہم چشمِ تر ہو جائیں گے
مجھ کو قدروں کے بدلنے سے یہ ہوگا فائدہ
میرے جتنے عیب ہیں سارے ہنر ہو جائیں گے
آتے جاتے راہروؤں کو دیکھتا ہوں اس طرح
راہ چلتے لوگ جیسے ہم سفر ہو جائیں گے
آدمی خود اپنے اندر کربلا بن جائے گا
سارے جذبے خیر کے نیزوں پہ سر ہو جائیں گے
کیسے قصے تھے کہ چھڑ جائیں تو اڑ جاتی تھی نیند
کیا خبر تھی وہ بھی حرفِ مختصر ہو جائیں گے
کاخ وکوئے اہلِ دولت کی بنا ہے ریت پر
اک دھماکے سے یہ سب زیر و زبر ہو جائیں گے
یہ عجب شب ہے انہیں سونے نہ دو ورنہ سلیم
خواب بچوں کے لئے وحشت اثر ہو جائیں گے

☆.....☆.....☆

رمضان کے بعد

میں روز جب تراویح پڑھنے مسجد میں داخل ہو رہی ہوتی ہوں تو مؤذن اذان عشاء بلند کر رہے ہوتے ہیں۔ مجھے خواتین کے لئے مختص حصہ میں دوسری صف میں جگہ ملتی ہے۔ پہلی صف میں کالے عبایا میں ملبوس نوجوان بچیوں کا ایک گروہ ہوتا ہے جو اذان سے پہلے ہی روزانہ وہاں اگلی صف میں موجود ہوتا ہے۔ تیسری صف میں کرسیوں کی قطار لگی ہوتی ہے جہاں کچھ معمر خواتین پہلے سے موجود ہوتی ہیں اور کچھ بعد میں آتی ہیں۔ آہستہ آہستہ دیگر صفیں بھی پر ہونے لگتی ہیں۔ اپنی ماؤں کی انگلی تھامے ننھے منے بچے بچیاں بھی ساتھ آتے ہیں جو کبھی تو اپنی امیوں کے ساتھ مل کر رکوع وسجود کر رہے ہوتے ہیں اور کبھی پیچھے موجود جگہ میں کھیل میں لگ جاتے ہیں۔ نوجوان بچیوں کی چستی اور پھرتی کے ساتھ سنتوں اور نوافل کی ادائیگی دیکھ کر دل سے دعا نکلتی ہے کہ یا اللہ میری امت کے نوجوانوں کے شوق عبادت کو برقرار رکھنا، اسے اپنے دین سے جوڑے رکھنا اور دین کا سرمایا بنانا۔

گزشتہ سالوں کے مقابلے میں اب خواتین کی تعداد میں اضافہ محسوس ہوتا ہے جس میں نوجوان بچیوں کی تعداد نمایاں محسوس ہوتی ہے۔ مسجد کے صحن میں چار نسلوں کو ایک ساتھ موجود دیکھ کر جہاں دل تشکر کے احساس سے لبریز ہو جاتا ہے اور یہ یقین دل میں جنم لیتا ہے کہ اسلام کا مستقبل انشاء اللہ ہمارے ملک میں روشن ہے وہاں یہ ایک خلش سی بھی دل میں جنم لیتی ہے کہ قران محض سننے کے لئے تو نہیں آیا۔ اگرچہ کہ اس کا سننا بھی مبارک، اس کا ایک حرف پڑھنا بھی مبارک لیکن اصل مقصد تو اسے تھام کر دنیا کو اس کی روشنی سے جگمگانا ہے۔ یہ تو حق و باطل میں فرق کا پیمانہ ہے جسے سامنے رکھ کر حق کو اپنانا اور باطل کو ترک کرنا ہے۔ یہ تو دلوں کی شفا ہے، اس کی دوا سے روحانی امراض کا علاج کرنا ہے۔ یہ تو اللہ کی دنیا میں لٹکائی ہوئی رسی ہے جسے تھام کر قرب الٰہی حاصل کرنا ہے۔ یہ تو وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں، اسے اس اعتماد کے ساتھ دنیا کے سامنے رکھنا ہے۔ اسے رہنما بنا کر تو جہاد کبیر کرنے کا حکم ہے یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو جائے۔ لیکن یہ مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم اس کے پیغام کو سمجھ کر اس پر عمل کے لئے تیار نہ ہوں۔ قران سننے کا ذوق وشوق بہت مبارک لیکن اس کلام کو سن تو لیں پر سمجھ نہ سکیں تو یہ بڑی محرومی کی بات ہے۔

مسجد میں ذوق وشوق سے ان تراویح پڑھنے والوں اور والیوں میں شاید ایک فیصد ہی قران پاک کا ترجمہ بھی سمجھ پاتے ہوں۔ اگر سب کے سب سننے والے ترجمہ بھی سمجھ پا رہے ہوتے تو ان کے دل کی دنیا کا کیا ہی عالم ہوتا۔۔؟ قرأت کانوں سے دل میں اترتی اور دلسوزی ونمی کے ساتھ آگے کے لئے بلند عزائم پیدا کرتی چلی جاتی۔ خشوع بڑھتا، عبرت پذیری بڑھتی، حلال وحرام کی حدود واضح ہوتیں اور انقلاب کی سوچ جنم لیتی۔ یہ ذوق وشوق، عقیدت، محبت عمل کے پیرائے میں ڈھل جاتی تو معاشرہ میں کتنی بڑی تبدیلی آجاتی۔

میں سوچتی ہوں کہ اے کاش کہ ہم اس آنے والے سال کو ''قران سمجھو تحریک'' کا سال بنالیں۔ نیک نیتی کے ساتھ اٹھائے گئے ایک قدم کو بھی اللہ تعالیٰ بے حد وحساب برکت عطا کر دیتا ہے۔ کئی سال پہلے جب حلقہ خواتین نے رمضان میں دورہ قرآن کی محافل منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو کون جانتا تھا کہ ایک وقت آئے گا کہ ملک کی ہر بستی اس کی خوشبو سے فیضیاب ہو رہی ہوگی۔ آج حلقہ خواتین اس روایت کے انعقاد میں تنہا نہیں بلکہ اور بہت سے بھی اپنے اپنے مقام اور انداز میں

ان بابرکت محفلوں کو سجائے ہوئے ہیں۔ گلی گلی قرآن کی تشریح بیان ہو رہی ہے۔ اگر یہ پیغام دلوں میں اتر جائے تو ملک کی تقدیر ہی بدل جائے۔

ماضی میں عربی سمجھنے اور سمجھانے کا عمل ایک طویل مدت طلب کرتا تھا لیکن اب جدید طریقہ کار کے مطابق مختصر مدت میں بھی اتنی عربی سمجھائی جا سکتی ہے کہ بڑی حد تک قرآن کا مطلب سمجھ آنے لگے۔ قرآن پاک کے 365 الفاظ ایسے ہیں جو قرآن پاک کے 85% حصے پر مشتمل ہیں۔ روزانہ ایک لفظ کا ترجمہ یاد کر لیں تو ایک سال میں 85% کا مطلب سمجھ آ جائے گا۔ ان میں سے بھی بیشتر الفاظ وہ ہیں جو خود اردو میں بھی بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کے یاد کرنے کے ساتھ بنیادی عربی قواعد کا علم حاصل کر لیا جائے تو قرآن کے معنی سمجھنے مشکل نہیں رہتے۔

رمضان کا مہینہ، شبوں کا گداز، قاری صاحبان کی تلاوت، کلام الٰہی کانوں میں اتر کر دل میں داخل ہو، مطلب سمجھ میں آ جائے تو ہیبت طاری ہو، رونگٹے کھڑے ہو جائیں، دل نرم پڑ جائیں، آنکھیں نم ہو جائیں، ایمان بڑھ جائے، عمل بدل جائے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ بہنیں جو قرآن فہمی کی نعمت رکھتی ہیں ان تراویح میں آنے والی خواتین میں سے قرآن سیکھنے کا شوق رکھنے والی چند بہنوں کو اپنا شاگرد بنا لیں۔ پورے سال ان سے رابطے میں رہیں اور انہیں اتنا قرآن سکھا دیں کہ اگلی بار تراویح میں وہ کلام اللہ سن رہی ہوں تو اسے سمجھ بھی رہی ہوں۔ یہ کام خود ان کے لئے صدقہ جاریہ بن جائے گا۔

اور اس سے بھی اچھا یہ ہو کہ ہماری اجتماعیت اسے منصوبہ بندی میں شامل کر لے اور قرآنی عربی سکھانے کے سہ ماہی کورسز تسلسل سے منعقد کئے جائیں اور ہر سیکھنے والی بہن کو اس سلسلہ کو آگے بڑھانے کی تاکید کی جائے۔ چراغ سے چراغ جلتے جائیں اور قرآن کی خوشبو ہمارے ماحول میں رچ بس جائے۔

جدید ٹیکنالوجی نے تو اس کام کو اور بھی آسان کر دیا ہے۔ گھر بیٹھی طالبات و خواتین کے بھی حلقے بنائے جا سکتے ہیں اور آن لائن گروپس کے ذریعہ بھی انہیں مستفید کیا جا سکتا ہے۔ طریقے تو بہت سے ہو سکتے ہیں لیکن پہلے عزم ہونا ضروری ہے۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

اے رب رحیم۔۔ سیکھنے والوں میں شوق اور سکھانے والوں میں عزم پیدا کر دے۔ ہمیں قرآن سے قریب کر دے۔ اس کا فہم ہم پہ آشکار کر دے اور ہمارا عمل اس کے مطابق بنا دے (آمین ثم آمین)۔

☆.....☆.....☆

حالیؔ اور تہذیب الاخلاق

قوموں اور افراد کی زندگی میں نصب العین کا تعیّن اور اس کے حصول کے لیے 'یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم' کے جذبے اور اصول پر سختی سے کاربند ہونا بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ کسی بھی قوم کی اخلاقی اقدار، تہذیب وتمدن اور معاشرتی زندگی کا بامِ عروج پر پہنچنا یا زوال پذیر ہونا اس امر پر منحصر ہوتا ہے کہ اس نے اپنے نصب العین یا اپنی منزلِ مقصود کو پانے کے لیے کیا لائحہ عمل تیار کیا ہے۔ حرکت اور جمود دو ایسے پیمانے ہیں جن سے زندہ اور مردہ قوموں کی پہچان ہوتی ہے۔ جو قومیں وقت کے بدلنے کے ساتھ خود کو بدلنا جانتی ہیں، جن کے اندر سعیٔ مسلسل، عزم، جستجو اور فکر وعمل کی استقامت پائی جاتی ہے اور جو نئے اندازِ فکر کو اپنانے سے گریز نہیں کرتیں وہی زندگی کے ہر میدان میں کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہیں، اور جو قومیں قدامت پسندی کو گلے سے لگائے رکھتی ہیں، نئے اندازِ فکر سے خائف رہتی ہیں اور طرزِ کُہن کو بدلنا نہیں چاہتیں ان پر جمود طاری ہو جاتا ہے، وہ بے حسی اور پسماندگی کا شکار ہو کر قعرِ مذلّت میں جا گرتی ہیں اور بالآخر فنا ہو جاتی ہیں۔

آئینِ نو سے ڈرنا ، طرزِ کُہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

قوموں کی زندگی انقلابات سے دو چار ہوتی رہتی ہے اور یہ انقلابات مختلف اقوام پر مختلف طریقے سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے افراد اور اقوام کو انقلاب خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا ہے۔ جبکہ بیدار اقوام سینہ سپر ہو کر حالات کا مقابلہ کرتی ہیں اور اپنے اندر موجود ان کمزوریوں اور خامیوں کو دور کرنے کے لیے جدوجہد کرتی ہیں جن سے ان کے وجود کو خطرہ ہوتا ہے۔ تشکیلِ نو کا یہ عمل ان کے اندر نئی روح پھونک دیتا ہے اور وہ تازہ دم ہو کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتی ہیں۔

۱۸۵۷ء کے خونیں انقلاب کے بعد دانشورانِ قوم اور محبانِ وطن کو اپنی قوم کے تحفظ و بقا کا شدت سے احساس ہونے لگا اور وہ قوم کی زبوں حالی اور احساسِ کمتری کو دور کرنے اور اس کے مستقبل کو تابناک بنانے کے لیے عملی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ ان ہی دردمندانِ قوم میں ایک نام مولانا الطاف حسین حالیؔ کا بھی تھا جن کے دل میں گردوپیش کی سرگرمیاں دیکھ کر ملّتِ اسلامیہ کی خستہ حالی دور کرنے کا جذبہ بیدار ہوا، اور اسی جذبہ کے تحت انھوں نے مسدّس حالی کی شکل میں ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جو ادب میں انسانی عظمت کا ضامن بن گیا اور جس نے اسلامی وقار اور ماضی میں مسلمانوں کے دبدبہ وعروج کا قصۂ پارینہ چھیڑ کر قوم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ حالیؔ کے اس عظیم کارنامے پر ان کے اپنے معاصر ہی نہیں آنے والی نسلیں بھی رشک کرتی ہیں اور انھیں اپنا مسیحا تسلیم کرتی ہیں۔

انقلاب برپا ہونے کے دوران اَن گنت حساس افرادِ قلم کے سپاہی بن کر اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے امن وانسانیت کے لیے سرگرم ہو اُٹھے۔ انسانی فلاح وبہبود کی خاطر جدوجہد کرنے والوں کی راہیں جُدا ضرور تھیں مگر منزل ایک تھی۔ وہ سب اپنے اپنے وسائل اور اپنی اپنی سوچ کے مطابق میدانِ عمل میں سرگرم تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کئی ذرائع یا طریقے استعمال ہو رہے تھے مثلاً حالیؔ نے احساسات کو بیدار کرنے کے لیے اصنافِ سخن کے مختلف حربوں کا استعمال کیا۔ انھوں نے مثنویاں لکھیں، نظم کو فروغ دیا، شاعری کو مختلف عنوانات کے تحت عام کیا، علمی و ادبی اور صحافتی مضامین لکھے۔ جدید ایجادات اور معلومات سے لوگوں کو واقف کرایا۔ غرض کہ ہر زاویے سے قوم کو بیدار کرنے کا

جتن کیا۔ یہاں ان کی گونا گوں اور گراں بہا خدمات کی تفصیل پیش کرنا مقصود نہیں بلکہ اس جانب توجہ مبذول کرانی ہے کہ فضا اور ماحول کو ساز گار بنانے میں رہنما کا انتخاب و اعتماد بھی بہت کارگر ہوتا ہے۔ بلا شبہ حالی ایک ایسے گھرانے کے چشم و چراغ تھے جہاں تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ والدین کی نگہداشت کے ساتھ ساتھ اساتذہ اور احباب بھی ایسے ملے جنھوں نے حالی کی شخصیت کو نکھارنے میں ذہنی صیقل گر کا کردار انجام دیا لیکن سرسید کی صحبت نے اس صیقل گری کو نئی جلا بخشی جس کا اعتراف حالی نے بھی بڑی عقیدت اور محبت سے کیا ہے۔

سرسید سے حالی کی پہلی ملاقات سائنٹفک سوسائٹی کے جلسہ، منعقدہ علی گڑھ ۱۸۶۷ء میں ہوئی۔ وہ جہانگیر آباد، ضلع بلند شہر کے نواب مصطفی خاں شیفتہ کے ساتھ اُس مردِ مجاہد کو دیکھنے اور سننے کے لیے آئے تھے جس سے وہ غائبانہ طور پر متاثر تھے۔ ذہنی مطابقت اور موافقت کا جذبہ اُسی وقت پیدا ہو گیا تھا جب سرسید نے غازی پور (۱۸۶۴ء) میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی اور انگریزی مدرسہ قائم کیا۔ حالی نے بھی اسی سال ''مولود شریف'' لکھی۔ دراصل یہ مشرق کو مغرب سے اور مغرب کو مشرق سے ملانے کی غیر شعوری کوشش تھی جس نے دسمبر ۱۸۷۰ء میں ''تہذیب الاخلاق'' کی صورت میں عملی شکل اختیار کی۔ ذہنی ہم آہنگی اور بے لوث خدمت کے جذبے نے حالی کو سید والا گہر کے اور بھی قریب کر دیا۔ ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ اس قربت کو تقویت دینے میں رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' بہت معاون ثابت ہوا۔ اس کا ذکر ''حیاتِ جاوید'' کے پانچویں باب میں، صفحہ ۱۶۴ سے ۱۷۴ میں ملتا ہے۔ حالی نے اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ یہ رسالہ تجارتی بنیادوں پر نہیں نکالا گیا بلکہ قوم کی فلاح و بہبود اور جدید علوم و فنون کو فروغ دینے کے لیے جاری کیا گیا ہے، اس لیے جو کچھ آمدنی ہوتی وہ اس کی ترقی میں صرف کی جاتی۔ انھوں نے اس کے مثبت اثرات کی نشاندہی ''آبِ حیات'' میں ''تہذیب الاخلاق کے نتائج'' کے عنوان سے صفحہ نمبر ۳۵۱-۳۵۰ پر مدلل کی ہے۔

''تہذیب الاخلاق'' کا پہلا دور ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء سے ۲۰ر ستمبر ۱۸۷۵ء پر مشتمل ہے، اس میں حالی کی محض ایک تحریر ہے لیکن دورِ دوم میں جو ۲۳ر اپریل ۱۸۷۹ء سے ۲۸ر جولائی ۱۸۸۱ء پر مبنی ہے اور دورِ سوم میں جو ۷ر اپریل ۱۸۹۴ء سے ۳ر فروری ۱۸۹۷ء پر مشتمل ہے، حالی چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''جوں جوں تہذیب الاخلاق 'مدرسۃ العلوم' کی طرف لوگوں کو بلاتا تھا اور جس قدر انگریزی تعلیم کی ضرورتیں ان کے ذہن نشین کرتا تھا، اسی قدر مدارسِ اسلامیہ قائم کرنے کا جوش مسلمانوں میں بڑھتا جاتا تھا چنانچہ اسی کی تحریک سے بے شمار اسلامی مدرسے ہندوستان میں قائم ہو گئے اور برابر ہوتے جاتے ہیں۔'' (ص، ۳۵۱)

مولوی سخاوت علی اس تعلق سے فرماتے ہیں:

''اگر چہ پہلے بھی ہم کو اپنی قوم کی بھلائی کی فکر تھی مگر کوئی تقاضہ کرنے والا اور بار بار جگانے والا نہ تھا۔ اب تہذیب الاخلاق نے یہاں تک چوکنا اور آگاہ کیا جس کے سبب اس قصبہ میں بھی ایک مدرسہ قائم ہو گیا۔ خدا اس پرچے تہذیب الاخلاق کو ہمارے لیے ہمیشہ مبارک رکھے۔'' (ص ۳۵۱)

حالی کی معروف تصنیف ''مسدّس حالی'' جو ایک طرح سے علی گڑھ تحریک کے بنیادی اصولوں کی تشریح و تفسیر بھی ہے، وہ پہلی بار اسی مجلہ میں شائع ہوئی۔ اس کی تفصیل ڈاکٹر عطا خورشید کے بے حد معلوماتی مضمون میں درج ہے اور سرسید کا وہ مراسلہ بھی جو رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہوا ہے۔ سرسید اپنے خط مورخہ ۱۰ر جون ۱۸۷۹ء میں لکھتے ہیں:

''.....مسدّس پہنچی۔ جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی، جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر اس مسدّس کی بدولت فنِ شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے، بیان سے باہر ہے.....حق ہے، جو دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔..... بے شک میں اس کا محرک ہوا، اور اس کو میں اپنے اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو میں کہوں گا حالی

سے مسدّس لکھوالا یا ہوں اور کچھ نہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔.....آپ کے اس خیال کا کہ حقِ تصنیف مدرسۃ العلوم کو دیا جاوے اور رجسٹری کرادی جاوے، میں دل سے شکر کرتا ہوں.....میں اس کُل مسدّس کو تہذیب الاخلاق میں چھاپوں گا۔''

(آرکائیوز، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

سرسید نے حسبِ وعدہ اسے چھ قسطوں میں تہذیب الاخلاق میں شائع کیا۔ مسلمانوں کے کھوئے ہوئے دبدبے، وقار اور جلال و جمال کی کی تفصیل پر مبنی اس تخلیق کی بے پناہ تعریف ہوئی جو تہذیب الاخلاق کے ۱۸۸۰ء اور ۱۸۸۱ء کے صفحات میں درج ہے۔

مدّوجزرِ اسلام یعنی مسدّس حالی کے شائع ہونے کے بعد بھی حالی ''تہذیب الاخلاق'' میں برابر لکھتے اور چھپتے رہے۔ سرسید کے انتقال کے بعد محسن الملک اور وحیدالدین سلیم کی سرپرستی میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ساتھ تہذیب الاخلاق ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۷ء تک شائع ہوتا رہا اور حالی اس میں برابر شریک رہے۔ اس پورے عرصہ میں موصوف کے جو مضامین منظرِ عام پر آئے انھیں انجمن ترقی اردو، حیدرآباد (دکن) نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ (ماہنامہ تہذیب الاخلاق نے ان میں سے کئی مضامین کو دوبارہ یکم اگست ۱۹۸۳ء، ۱۶/اگست ۱۹۸۳ء، یکم ستمبر ۱۹۸۳ء، ۱۶/ستمبر ۱۹۸۳ء، جنوری ۱۹۸۹ء، مئی ۱۹۹۰ء، جولائی ۱۹۹۰ء میں شائع کیا ہے۔) ان سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ حالی اور ''تہذیب الاخلاق'' دونوں کا مقصد یہ تھا کہ ---

۱۔ جدّت اور ندرت سے کام لیا جائے۔

۲۔ مثبت اثرات ڈالنے والی رسوم کی پاسداری پر زور دیا جائے۔

۳۔ روایات کی جکڑ بندی کے خلاف آواز بلند کی جائے۔

۴۔ توہمات سے گُریز اور عقلیت پسندی کا احساس دلایا جائے۔

۵۔ عقائد کو شعور کی آنکھ سے دیکھنے اور دکھانے کی سعی کی جائے۔

۶۔ مغربی علوم سے استفادہ پر اصرار کیا جائے۔

۷۔ نئے حقائق کو تسلیم کرنے پر عوام و خواص کو رضامند کیا جائے۔

حالی اور تہذیب الاخلاق کے مشترکہ نصب العین کی تفصیل سے گُریز کرتے ہوئے یہاں اُن کے محض ایک مضمون بعنوان ''ہم جیتے ہیں یا مر گئے'' جو تہذیب الاخلاق میں مارچ ۱۸۹۵ء میں شائع ہوا، کا مختصراً ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ اس میں انھوں نے عمل اور بے عملی کی کیفیت اور ذہنی کشمکش کا نقشہ معروضی انداز میں پیش کیا ہے:

''ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیے لیکن کچھ کرتے نہیں۔''

آگے لکھتے ہیں:

''ہم دنیا اور دنیا کے کاموں کو اکثر فانی اور حقیر بتاتے ہیں مگر اس لیے نہیں کہ فی الحقیقت ہم دنیا کو ایسا ہی سمجھتے ہیں بلکہ صرف اس لیے کہ ہم کو ہاتھ پاؤں ہلانے نہ پڑیں۔''

دلیل اور دعوے کے پہلو بہ پہلو وہ یہ بھی اجاگر کرتے ہیں:

''ہم کہتے سب کچھ ہیں مگر کرتے کچھ نہیں۔ ہماری حالت ہم کو جھٹلاتی ہے۔''

عوام خصوصاً مسلمانوں کو آئینہ دکھلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

''کبھی کبھی ہمارے بھائیوں کے دل میں ایک غیر معمولی جوش دودھ کے اُبال سے بھی زیادہ خود بہ خود اٹھتا ہے اور ہم کوئی انجمن .....اسلامی یا انگریزی مدرسہ قائم کرتے ہیں، کوئی رسالہ یا اخبار محض قوم کے فائدے کی غرض سے جاری کرتے ہیں.....مگر حقیقت سے اُوپر والا خوب واقف ہے۔''

مضمون کے آخر میں انھوں نے چند تدابیر بھی بیان کی ہیں جو سر سید کے افکار و خیالات کی غماز ہیں۔

تہذیب الاخلاق کے ذریعے سرسید اور حالی کی مشترکہ کوششیں تہذیبی، تمدنی اور ادبی انقلاب کی ضامن ثابت ہوئیں۔ دونوں کے لیے یہ ایک موثر آلہ اور کارگر حربہ تھا، دل کی بات سُننے اور سُنانے کا، خود مطمئن ہونے اور قوم کو اطمینان دلانے کا، بگڑی ہوئی صورتِ حال کو خوشگوار اور

گرد و غبار سے اٹھی ہوئی فضا کو معطر بنانے کا۔ یہی وجہ ہے کہ حالی کو یہ رسالہ بے حد عزیز تھا اور جب بھی اس پر بُرے دن آئے وہ بے چین ہو ئے، اور اسے جاری کرنے کا جتن کیا۔

حالی نے بہت سوچ سمجھ کر اپنے رہنما کا انتخاب اور ان پر مکمل اعتماد کیا۔ وہ خود انھیں پیر و مرشد کہہ کر پکارتے۔ پیر و مرشد کی ہر چیز کو عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھنا ایک عام سی بات ہے لیکن حالی کو سر سید اور ان کے بیٹے سیّد محمود کس حد تک عزیز رکھتے تھے اس کا احساس سر راس مسعود کے مضمون بعنوان ''خواجہ حالی کی دو تصویریں'' سے ہوتا ہے جو پہلے بھوپال میں اور پھر ماہنامہ ''زمانہ'' کانپور کے حالی نمبر میں شائع ہوا۔ اس تفصیلی مضمون میں درج ہے کہ رات کا وقت تھا۔ میز لگی ہوئی تھی۔ ایک سرے پر دادا تشریف فرما تھے۔ ان کی داہنی جانب حالی اور میرے والد بیٹھے ہوئے تھے۔ قومی معاملات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میرے والد کے منہ سے ایک جملہ ادا ہوتا ہے:

''ابّا جانی! اگر خدا مجھ سے کبھی یہ سوال کرے کہ میرے جتنے بندوں سے تُو ملا ہے اُن میں سے کون ایسا ہے جس کی پرستش کرنے کے لیے تیرا دل تیار ہو جائے، تو میرے پاس جواب حاضر ہے اور وہ یہ کہ وہ شخص الطاف حسین حالی ہے۔'' (ص، ۴۰۸)

راس مسعود، سید محمود کی یہ بات سن کر حیران ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ وہ فوراً اپنی والدہ کے پاس پہنچے اور دریافت کیا:

''یہ کون صاحب ہیں جن کی پرستش کرنے کے لیے میرے والد صاحب تیار ہیں۔'' (ص، ۴۰۸)

سر راس مسعود لکھتے ہیں کہ والدہ محترمہ کی زبانی جو انھیں تفصیلی جواب ملا اس سے حالی کی عظمت میرے دل پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گئی:

''پہلی دفعہ مولانا مرحوم کی عظمت کا بیج میرے دل میں بویا جاتا ہے اور جب کبھی میں ان کو دیکھتا ہوں تو اپنے دل میں کہتا ہوں کہ یہ انسان نہیں فرشتہ ہیں۔ باوجود اس کے کہ اب میری عمر تقریباً پچاس سال ہو گئی ہے، میرے دل میں وہی عظمت اُن کی ہے اور وہی محبت اُن سے قائم ہے جو بچپن میں تھی۔''

(بحوالہ ڈاکٹر عطا خورشید، ماہنامہ تہذیب الاخلاق، جنوری ۲۰۱۵ء، ص ۴۶)

سر راس مسعود کے مضمون سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ سر سیّد کے تعلیمی اور اصلاحی مشن کو کامیابی سے ہمکنار کرانے میں ''تہذیب الاخلاق'' کا رول مرکزی رہا اور اس رسالہ نے ذہنی بیداری کے جس رویہ کو پروان چڑھایا اس میں حالی کی تخلیقات نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

☆.....☆.....☆

حمیرا خالد

گھر رابطے سے چلتے ہیں ضابطے سے نہیں

سسرال کو اپنا بنائیں

لکھاری ہونے میں ایک عجب لذت ہے ۔ جو بات کسی کے سامنے کہنے کا حوصلہ نہ ہو قلم اٹھاؤ اور لٹھ چلا دو ۔کوئی روکنے والا نہیں ہاں ٹوکنے والے ضرور ابل پڑتے ہیں ۔اور پھر یہ گوناگوں تبصرے نہ صرف لذت دے رہے ہوتے ہیں بلکہ عزم اور حوصلے بڑھا رہے ہوتے ہیں ۔ ایک ہی تحریر کسی کے لئے قابل مذمت ہوتی ہے تو کسی کے لئے قابل ستائش ۔غرض اپنا اپنا انداز فکر ہے کہ کون اپنے مشاہدات کی روشنی میں کیا اخذ کرتا ہے۔

لکھاری تو بس گردوپیش کے رویوں کو زبان دیتا ہے اس خیال سے کہ عقلمند کو اشارہ کافی ۔لیکن کبھی کبھار یہ منظر نگاری ایسی الٹی پڑتی ہے کہ الامان!

حال ہی میں شوق اٹھا کہ سنجیدہ اور نصیحت آموز مکالموں سے ہٹ کر کچھ طنز و مزاح میں بات کی جائے حقائق کی تصویر کشی بھی ہو جائے اور خوشگوار احمقانہ حرکتوں پر مسکراہٹیں بھی بکھر جائیں ۔بھر ہوا کچھ یوں کہ اپنے اردگرد ساس اور بہو کے تنازعہ سنتے سنتے ہم نے لگی لپٹی رکھے بغیر وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو ان دنوں سسرال میں بہوؤں سے شکایتیں تھیں ۔ادھر بہوؤں کو آئینہ دکھا دیا کہ جو کچھ وہ اہل سسرال کے ساتھ کر رہی ہوتی ہیں۔

اصلاح تو ادھر ہوئی نہ ادھر.....البتہ اپنی اصلاح خوب ہوگئی اور ہمیں تیر بہ ہدف کا مطلب سمجھ آ گیا۔

مثلاً چند تبصرے

واہ جی واہ کیا سبق دے رہی ہیں قوم کی بیٹیوں کو.....ارے ان کو کیا فرق پڑتا ہے ۔ان کی کونسی بہو ہے.....کسی کا گھر ٹوٹتا ہے تو ٹوٹے جی.....اپنی بہو ہوتی تو جانتے کیسے سسرال والوں کو ناک آؤٹ کیا جاتا ہے۔

اری بہن کچھ لکھنا تھا تو خیر کی بات ہی لکھ لیتیں.....اصلاح کے چند جملے ہی ڈال دیتیں ۔وغیرہ وغیرہ۔اور ہم ان برستے تیروں کی زد میں سوچ رہے تھے کہ یہ کیا کر ڈالا ۔کیا تلافی بھی ہو سکے گی یا نہیں خیالات مجتمع کیے سوچ رہے ان پاکباز مثالی بہوؤں کو تصور میں لائے جنہوں نے قابل قدر خدمات انجام دیں اور فوراً ہی ایک انتہائی حکیمانہ نسخہ پیش کیا۔جو پانچ نکال پر مشتمل تھا۔حاضر خدمت ہے۔

☆ شادی کے بعد پہلے تین سال شوہر کے نام کر دیئے جائیں۔ اس کے موڈ کے مطابق اپنے موڈ کو ڈھالیں۔

☆ شوہر سے اس کے ماں باپ کو دور کرنے کی ہرگز بھول نہ کریں ورنہ یہ پھول اپنی جڑ سے نکل کر آپ کے گلدان کی زینت بن تو جائے گا لیکن بالآخر مرجھا جائے گا۔

☆ اپنے سسرال کے مسائل میکے میں نہ لائیں بلکہ حل کرنا سیکھیں۔

☆ میکے جانے کا وقت اور دن آپس کے مشورہ سے طے کرلیں، وقت بے وقت کا آنا جانا ماحول کو خوشگوار نہیں رہنے دیتا۔

☆ زبان کے غیر محتاط استعمال سے دلوں میں دراڑیں پڑ جایا کرتی ہیں، بعض اوقات ایسے تبصرے اور جملے نکل جاتے ہیں جو توہین آمیز ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ انسان کی نفسیات کا بھی خالق ہے وہ جانتا ہے کہ stress free اور پرسکون خاندان اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک کہ فریقین کو اپنے جذبات، زبان، معاملات میں جوابدہی کا احساس نہ ہو۔

ان جامع نکات کو پیش کر کے ہم مطمئن تھے کہ اب وہ گھر جو

ہمارے طنز ومزاح سے اجڑ رہے تھے اب یقینا بس چکے ہونگے۔ وہ پہلا رشتہ جو آسمان سے اتارا گیا وہ ماں باپ تھے نہ بہن بھائی بلکہ یہ میاں بیوی کا عظیم جوڑا تھا، جس نے خاندان کی بنیاد رکھی اور پھر دیگر رشتے بنتے اور جڑتے چلے گئے۔ یوں کہ ان کے درمیان حقوق وفرائض کی زنجیر پہنا دی گئی۔

مگر یاد رہے کہ ہمارا دین حقوق اس لئے بیان کرتا ہے کہ فرائض ادا کرنے والے کو آگاہی ہو کہ اسے کیا کرنا ہے۔ ورنہ دین میں حقوق طلبی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے ہاں عدل بہت ضروری ہے جبکہ خاندان میں خوشگواری کی فضا پیدا کرنے کیلئے صرف عمل ہی کافی نہیں بلکہ ضرورت ہے کہ احسان اور رحمت کا معاملہ کیا جائے۔ یعنی اپنے حق سے کم پر راضی ہو کر دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ دے دیا جائے۔

ان تمام آزمودہ نصائح کے بعد بھی اس حقیقت کو مانے بغیر چارہ نہیں کہ خاندانوں میں اختلافات کا پایا جانا لازمی اور فطری امر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی ساخت ہی میں اختلاف رکھا ہے۔ رنگ روپ، مزاج چلن موسم کا تبدل ہر شے میں تغیر بھی ہے اور مختلف بھی۔ کوئی بھی دو چیزیں ایک جیسی نہیں پھر بھی کائنات میں کہیں فساد ہے اور نہ بے ترتیبی ہے، پھر انسانی رشتوں میں پایا جانے والا اختلاف جھگڑے اور فساد کا باعث آخر کیوں ہے حالانکہ یکسانیت کے مقابلے میں اختلاف میں زندگی زیادہ دلچسپ ہے بات یہ ہے کہ فی زمانہ اختلافات کو حسب موقع manage کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ یکسر دور کرنے کی تگ ودو میں ہلکان ہوا جائے۔ صرف تھوڑے سے تحمل اور برداشت سے بڑے بڑے طوفانوں کا رخ بدلا جا سکتا ہے۔ لہذا کہیں بھی سو فیصد موافقت کی طلب رکھنا درست نہیں جب جہاں کدورت سر اٹھائے تو بہتر ہے کہ وہاں خوبیوں پر نظر کی جائے اور اختلافی اسباب کو نظر انداز کیا جائے تو دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ اور اختلافات کے باوجود فضا خوشگوار محسوس ہوگی۔ جو لوگ آپس کی ناپسندیدگی اور ناگواری کے باوجود سمجھوتے کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں ان کے درجے بہت بلند ہوتے ہیں۔

یہ بتاتے ہوئے ہم نے قلم کو بند کرنے میں عافیت جانی کہ گھر رابطے سے چلتے ہیں ضابطے سے نہیں۔ ضابطہ تو یہ ہے کہ بیوی پر شوہر کے ماں باپ کی خدمت کو اولیت نہیں۔ لیکن رابطہ یہ ہے کہ ان کو بھی اپنے ماں باپ سمجھا جائے اور خدمت میں کسر نہ چھوڑی جائے اور جو کام رب کی خوشنودی کے لئے کیا جاتا ہے وہ عبادت بن جاتا ہے، عبادت وہی کرتا ہے جس میں تقویٰ ہو۔ تقویٰ کے بغیر ازدواجی زندگی کی کامیابی ممکن نہیں، تقویٰ رکھنے والے بڑے بڑے مصائب ہنسی خوشی جھیل جاتے ہیں۔ جبکہ کتنے لوگ ہیں جن کو کانٹا ہی چبھ جائے تو دم لبوں پر آجاتا ہے۔ مصائب انکو پاگل کر دیتے ہیں اور زندگی تنگ ہو جاتی ہے۔

اللہ سے جن لوگوں کا تعلق زیادہ ہوتا ہے ان میں معاف کرنے کی صلاحیت بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ اور جس کا اللہ سے تعلق نہیں ہوتا وہ اپنا بدلہ آپ لیتا ہے اور اسی ادھیڑ بن میں اپنی زندگی اجیرن بنا لیتا ہے۔ یہ خوف خدا ہے جو حقوق دینے کی فکر دیتا ہے لینے کی نہیں۔

☆.....☆.....☆

عورت، غیرت کا سرکس اور نفس کا کنواں

غیرت کیا ہے؟ غیرت کے نام پر قتل کیوں کیا جاتا ہے؟ غیرت کیوں بلبلا اُٹھتی ہے؟

غیرت دراصل آدمی کے اندر کی فطری عُریانیت کا خود ساختہ ظاہری لباس ہے۔ غیرت کے نام پر قتل، دراصل بھائی اور باپ نامی مرد کے اندر سرایت کی ہوئی جنسی بیماری کا ردِعمل ہے!

جب اس کی بہن یا بیٹی کسی مرد کی طرف راغب ہوتی ہے تو یہ بات اس کے اندر کی فطری عریانیت کے تصوّر میں عین اُس طرح اسے دکھائی دیتی ہے جس طرح وہ کسی بھی غیر عورت کے تصوّر کو اپنی شہوانی ضرورت کے تحت استعمال کرتا رہا ہے۔ جس فطری خیال کی وہ اپنے نفس کی تاریکی اور خلوَت میں لذّت لیتا رہا ہے، اُسی تصوّر کے فریم میں اس کی بہن یا بیٹی کسی اور مرد کے ساتھ آ جاتی ہے اور وہ بلبلا اُٹھتا ہے۔ غیرت کے نام پر قتل اسی بلبلاہٹ کا ردِعمل ہے۔ اپنی اسی فطری عُریانیت کے نفسیاتی دباؤ میں وہ اپنے گھر کی چاردیواری کے اندر اِس گمان میں رہتا ہے کہ وہ بہنوں اور بیٹیوں کے جسم تو کیا، خیال تک پر پہرے کی طاقت رکھتا ہے، اس خوش فہمی کے ساتھ کہ یہ اس کی طرح کی انسان ہو ہی نہیں سکتیں۔ نہ تو ان کے اندر فطری جنسی ضرورت نام کی کوئی چیز ممکن ہے اور نہ ہی ان تین کپڑوں کے اندر جسم نام کی بھی کوئی چیز ہے۔ اور وہ جسم ہی اس کا اصل پرابلم ہے دراصل۔

اور جب بہن یا بیٹی اپنی زندگی کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی مرضی کے مطابق کسی مرد کے ساتھ زندگی گزارنے کا اعلان کرتی ہے یا اس تعلق میں پکڑی جاتی ہے تو اس پر مقرر پہریدار مرد کی پہریداری ناکارہ ثابت ہو جاتی ہے گویا، کہ اس کی مقبوضہ لڑکی تک ایک غیر مرد کی رسائی! یا اس کے اندر ایک غیر مرد کا خیال! ظاہر ہے کہ بالکل اسی طرح جیسے اس کے ساتھ ایک غیر عورت یا اس کا خیال!

یہ بات نمایاں طور پر دیکھی گئی ہے کہ خاص طور پر بھائی غیرت کے نام پر بہن کا قتل ڈنکے کی چوٹ پر کرتا ہے اور بہن کی لاش کو غیرت کا سرٹیفکیٹ لینے کے لیے انتہائی بے غیرتی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش بھی کرتا ہے۔ دراصل اپنی بلبلاہٹ میں وہ چاہتا ہے کہ چوراہے پر موجود تماش بین اسے یقین دلائیں کہ تمہاری بہن جسم نام کی کوئی چیز قطعی نہیں رکھتی تھی کہ جس کا کسی مرد سے تعلق بن سکے۔ پہلے وہ صرف زندہ لاش تھی اور اب وہ مردہ لاش ہے۔ تماش بین خود بھی اپنے اندر کی عُریانیت سے گھبرائے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ کسی اور کی بہن کی لاش پر اپنے نفس کی گندگی پر ڈھکن رکھے جانے کی آسودگی حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ آدمی کے اندر کی عُریانیت کی یہ کشمکش کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ.....آدمی کی نگاہ فطری طور پر پہلے عورت کے جسم پر پڑتی ہے، پھر اُس سے منسوب رشتے پر (اور یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ انسانی فطرت ہے) مگر اس سے وہ اپنے اندر خوفزدہ تب ہوتا ہے جب خود اپنی نگاہ کی عریانیت کی چوری پکڑنے لگتا ہے۔ اسی لیے دیکھا گیا ہے کہ گھر کے اندر بھی بہنوں اور بیٹیوں کو خود کو ڈھانپے رکھنے کے لیے دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ باپ بھائی کے سامنے خود کو ڈھانپ کر آؤ۔ شرم دلائی جاتی ہے بھائی باپ کے سامنے کھلے ڈُلے آنے سے۔ ایسا تب ہی ہوتا ہے جب بچی جوان ہونا شروع ہوتی ہے اور رشتے سے بڑھ کر ایک individual جسم کی شکل اختیار کرنے لگتی ہے۔ جبکہ بہن کو بھائی، بھائی ہی دکھتا ہے اور باپ، باپ ہی دکھتا ہے۔ اسی لیے اسلام مرد کی فطرت کو سفّاکیت کے ساتھ دیکھتے ہوئے چند ایسے احکامات دیتا ہے

جو ہم سے ہضم نہیں ہو پاتے۔

مثلاً: بچپن کی ایک خاص عمر کے بعد بھائی بہن کو ایک ہی بستر پر سلانے سے منع کیا گیا ہے۔

مثلاً: adopted اور منہ بولے رشتوں کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ چاہے بھائی بہن کا ہو یا باپ بیٹی کا۔

مثلاً: مرد کو عورت کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے (یہاں میری مراد امامت نہیں)۔ مُلّا چاہے ہزار بحث کرے کہ اس طرح کے احکامات میں عورت کی ذلّت مقصود ہے مگر نہیں ہے ایسا۔ اس طرح کے احکامات میں آدمی کی فطرت میں پوشیدہ جنسی ننگے پن کو سفّاکیت سے دیکھا گیا ہے۔ اس کی نگاہ اس قابل نہیں کہ اس کے آگے عورت کا جسم نماز ادا کر رہا ہو اور وہ عین اس کے پیچھے نگاہ جھکا کر اپنی نماز کو قائم کر سکنے کا اہل ہو پائے۔ سورۃ بقرہ میں عدت میں بیٹھی عورتوں کے لیے مردوں کو کہا گیا ہے کہ اللہ جانتا ہے کہ ان کے لیے تمہارے دلوں میں خیال آئے گا ہی (دیکھ لیجیے آدمی کی فطرت کی کتنی کھلی پرکھ ہے کہ تنہا ہو چکی عورت کو دیکھ کر تمہیں خیال آئے گا ہی) سو جب وہ عدت سے فارغ ہو جائے پھر اُسے propose کر سکتے ہو۔

مگر ہمیں اپنے اردگرد، مختلف تعلقات اور رشتوں کی صورت میں وہ مرد کثیر تعداد میں ملتے ہیں جو غیرت کے جنسی اور نفسیاتی مرض میں مبتلا نہیں دِکھتے! یہ وہ مرد ہے جو انسانی نفسیات کی اس اونچ نیچ پر زیادہ غور کیے بغیر خاموشی سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ جیسے ہم اندھیرے سے جلد از جلد گزر جانا چاہتے ہیں۔ جیسے ہم کیچڑ پھلانگ کر نکل جاتے ہیں۔ اسے بیٹی خوبصورت دکھتی ہے تو سینے سے لگا کر کہہ دیتا ہے کہ میری بیٹی کتنی خوبصورت لگ رہی ہے۔ بہن پُرکشش دکھتی ہے تو محبت اور تعریف کا اظہار اسے نہایت آسانی سے نفس کی تنگ گلی سے نکلنے کا راستہ دے دیتا ہے۔ بہن بیٹی سے محبت مرد کی نگاہ میں نرمی بھر دیتی ہے اور وہ اس کے حسن اور جوانی سے گھبراتا نہیں، محبت بھری نظر سے نظر بھر کر اسے دیکھ بھی سکتا ہے اور اسے گلے سے بھی لگا سکتا ہے۔

محبت ہی وہ واحد احساس ہے جو انسان کے اندر کی گندگی کو دھو ڈالتا ہے۔ طوافِ عمرہ کے دوران مرد اور عورت کو دیکھ لیجیے۔ مرد کا جسم آدھا کھلا ہوتا ہے اور بھیڑ کی شدت میں عورت اور مرد ایک دوسرے سے لگ کر چل رہے ہوتے ہیں۔ اُس ہجومِ بیکراں میں نفس کے ماروں اور گناہگاروں کی یقیناً اکثریت ہوتی ہے، چاہے مرد ہو، چاہے عورت ہو۔ مگر وہ کیا چیز ہے جو طواف کرنے والوں کو اپنے اور دوسرے کے جسم سے لاتعلق رکھتی ہے؟ وہ ہے رب سے محبت۔ رب کے روبرو ہونے کی کیفیت۔ گناہوں اور خطاؤں کا اعتراف۔ دوسروں سے زیادہ اپنے گندے ہونے کا احساس۔

ورنہ نفس کی غریانیت کی یہی وہ تنگ گلی ہے جہاں کم عمر بچیاں خون کے انتہائی قریبی اور محرم رشتوں کے ہاتھوں درندگی کا شکار ہو کر موت کے گھاٹ اُتر جاتی ہیں۔

ایک غیرت کے نام پر قتل ہوتی ہے۔

ایک بے غیرتی کی بھوک پر۔

ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں یہ۔

عورت اور مرد کی تنہائی میں تیسرا شیطان موجود ہوتا ہے۔ شیطان ہماری ہی ذات کی معکوس نقل ہے۔ یقیناً ہوتا ہے بیچ میں مگر بحیثیت اشرف المخلوقات انسان کو شیطان پر برتری اور مزاحمت کی قوت حاصل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کی ہر عورت ریپ ہو چکی ہوتی اور ہر مرد ریپسٹ ہوتا۔ شیطان ڈرانے کی چیز نہیں ہے۔ شیطان بندے کا اپنے نفس پر اختیار کا ٹیسٹ ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ عورت اور مرد کی تنہائی میں شیطان اُنہیں گن پوائنٹ پر بہرحال مجبور کرتا ہو کہ اُٹھو اور ابھی کے ابھی میرے سامنے گناہ کرو۔ یوں بھی نہ ہی عورت کو ہر مرد اور مرد کو ہر عورت کشش کرتی ہے۔ یہ فطری خیال کہ یہ سامنے والا مرد کاش کہ میرا ہوتا! یا یہ خیال کہ یہ سامنے بیٹھی ہوئی پُرکشش عورت کاش کہ مجھے مل سکتی! عورت اور مرد کے بیچ سے ہو کر گزر بھی جاتا ہے اکثر، مگر کوئی قیامت نہیں آتی۔ بحیثیت اشرف المخلوقات دونوں اپنے اپنے اندر یہ ٹیسٹ پاس کر کے آگے بڑھ بھی جاتے ہیں اور بھول بھی جاتے ہیں، شیطان آیا شیطان آیا کا شور مچائے بغیر۔ مگر ہوتا یوں آیا ہے کہ مذہب کو

اپنی پگ بنانے والوں کو معاشرے میں سب سے پہلے عورت کے معاملے میں خود کو پارسا ثابت کرنا ہوتا ہے۔ کوئی ان سے یہ سوال کرے یا نہ کرے مگر چور کی ڈاڑھی کے تنکے کی طرح سب سے پہلی بات وہ یہ ہی ثابت کرنے کی اداکاری کرتے ہوئے نظر آئیں گے کہ ان کے اندر عورت کے جسم کی کوئی خواہش ہے ہی نہیں۔ وہ انسان نہیں فرشتے ہیں۔ دھلے ہوئے، پاک اور پوتر! مگر ہے تو وہ بشر۔ مرد۔

نفس کی فطری گندگی سے ہر شب وہ لت پت تو ہوتا ہی ہے مگر صبح ہوتے ہی بلبلا اُٹھتا ہے کہ تمام فساد کی جڑ عورت ہے۔ اسے مارو۔ اسے کھونٹے سے باندھو۔ اسے بند کرو۔ اسے ہی ڈھانپو۔ اسے دور کرو اپنی نظروں سے۔ یوں وہ اپنی گندگی پر قے کرتا چلا جاتا ہے۔ اپنے نفس کی یہ کشمکش اُس کے تشریح شدہ مذہب کو عورت سے نکلنے ہی نہیں دیتی۔ ہر مسئلہ عورت سے اُٹھ کر عورت پر تمام ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اپنی مذہبی ٹھیکیداری کی پگ اونچی رکھنے کے لیے عورت پر تھوتھو کرنے کی ترغیب دینا شروع کر دیتا ہے۔

اسلام اسی مرد کے نفس کے سرکش گھوڑے کو قابو میں رکھنے کے لیے چار شادیوں کی اجازت دیتا ہے مگر اُن چار شادیوں کو قرآن میں یوں مشروط کرتا ہے کہ اگر تم ان کے درمیان انصاف کر سکو۔ پھر یہ بھی کہہ دیا کہ جو کہ تم نہیں کر پاؤ گے۔ چار شادیوں کی اجازت بھی محض نفس کے سرکش گھوڑے پر قابو پانے کے لیے ہی نہیں دی گئی۔ معاشرے اور حالات کے کئی طرح کے اُتار چڑھاؤ کے اسباب بھی اس میں شامل ہیں، مگر سب سے اہم یہاں بھی نکاح میں عورت کی قبولیت اوّلین شرط ہے، کہ وہ مرد کی دوسری، تیسری اور چوتھی بیوی بننا چاہتی ہے یا نہیں! اس لیے بھوک مٹانے کے لیے سب ہی کو چار میسّر بھی نہیں ہو سکتیں۔

پھر ذرا غور کیا جائے تو پارسا حور کا وعدہ دراصل نیک مرد کے ساتھ کیا گیا ہے جو معاشرے میں اپنے نفس کی فطری گندگی کو قابو میں رکھتا ہے۔ راہ چلتی عورتوں کو گریبان سے پکڑ کر تھوتھو کرنے کے بجائے اپنی نظر کو جھکا کر رکھتا ہے اور اللہ سے اپنی وابستگی کو اپنی ذات اور ذاتی مفادات اور نفس کی سرکشی پر فوقیت دیتا ہے اور جو جانتا ہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ یہ نظر جھکانا کیا ہے؟ نظر جھکانے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مرد سڑک پر سامنے دیکھنے کے بجائے زمین پر نظر رکھے اور کسی تیز رفتار گاڑی سے ٹکرا جائے۔ نظر وہ جس کی نیت کی اللہ کو ہم سے زیادہ خبر ہے۔ نظر وہ جو جھکتی ہے تو زمین کی طرف نہیں اپنے ہی اندر کی طرف دیکھتی ہے اور اپنے اندر کی گندگی کو دیکھ کر شرمندہ ہوتی ہے اور بے اختیار توبہ کی طلب گار ہو جاتی ہے۔

اب یہ نظر کمبخت خود تو جھکتی نہیں، نتیجہ اس کا نفسیاتی اور جنسی ردِعمل نکلتا ہے۔ اس یک طرفہ تقاضے کے ساتھ ظلم اور تشدد کی صورت میں سامنے آتا ہے کہ عورت کو نظروں سے دور کرو۔ حالانکہ سورہ نور کی آیت 30 میں پہلے مردوں کو اپنی نگاہیں جھکائے رکھنے اور اپنی شرم گاہ کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے پھر آیت 31 میں وہی حکم عورتوں کے لیے دیا گیا ہے کہ وہ'' بھی'' اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں.....''

مگر صرف آیت 31 کو پیش کیا جاتا ہے بلکہ اسے اپنے نفسِ بے لگام کے بچاؤ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ تو قرآن پاک کی حفاظت سے متعلق اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے جس کی وجہ سے اس میں کسی بھی ردّ و بدل کی مجال نہیں مسلمانوں کو ورنہ اس سے پہلے کی آسمانی کتابوں میں ردّ و بدل کر کے اللہ کے احکامات کو ہر دور کی male chauvinist پدرسری سوسائٹی میں اپنے معاشرتی مفادات اور رویّوں کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اور آج کل یہ رویّہ معاشرے میں صرف عورت کو گندا ثابت کرنے کا عملی طریقہ بن چکا ہے۔ عورت ہی کیا، ہم ہر معاملے میں آدھا حکم چھپاتے ہیں اور آدھا حکم پیش کرتے ہیں۔

یوں ایک ایسے معاشرے میں جہاں جہالت، جہالت کی لکیر سے بھی نیچے ہو، لیکن اس معاشرے کی بنیاد مذہب ہو، اور وہ بھی اس حد تک کہ کاروبار بن چکا ہو، وہاں اس طرح کے رویّے غیرت کو بھی مذہب کا سرٹیفکیٹ دے دیتے ہیں اور غیرت کے نام پر قتل کو بھی ورثاء کا حق قرار دے دیتے ہیں اور اس غیر انسانی فعل کو ہوا دینے کے ساتھ ساتھ مرد کے اندر کی جنسی گندگی کو بھی تھپکی دیتے ہیں کہ بُری تیری نگاہ نہیں

ہے۔ بُری دراصل عورت ہے۔

اس مذہبی اور معاشرتی ٹھیکیدار مرد کو یہ بتانے والا کوئی نہیں اس معاشرے میں کہ بھائی جان۔۔ تیری ماں بھی ایک عورت تھی۔ ایک مرد کے ساتھ سوئی تھی اور اس کی تسکینِ شہوت کے لیے استعمال ہوئی تھی۔ پھر اس کے پیٹ میں جو نطفہ ٹھہرا وہ نو مہینے اس کے خون کی آبیاری اور بڑے کٹھن دردِ زہ کے بعد تیری صورت میں پیدا ہوا۔ تیری خون نچوڑنے والی برسوں کی پرورش کے بعد اس کے پیروں تلے وہ بہشت آتی ہے جو دراصل تجھے کمانا ہے، اسے نہیں۔ اور وہ کمائی کیا ہے؟ تیرے باپ کی جنسی خواہشات اور تیری پرورش کی چکی کے دو پاٹ کے بیچ پس پس کر نڈھال ہو چکی عورت کی عبادت کی حد تک خدمت اور رضا حاصل کرنا۔ یہاں اللہ بھی اس کا طرف دار ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام تک کو براہِ راست خبردار کرتا ہے کہ سنبھل کر کوہِ طور پر آنا موسیٰ، تیری ماں نہیں رہی۔ سو حورانِ بہشت تو بہت آگے کی بات ہے، اس عورت کا حق ادا نہ کرنے کی صورت میں تو وہ اِک نگاہِ کرم بھی نہیں اُٹھے گی تیری طرف، جو گر اُٹھ جائے تو جھولی کے ساتھ ساتھ جتنے بھی خالی ہیں جام سب بھر جائیں گے۔ اس کا حق ادا کیے بنا چاہے تُو جہاد ہی کر لے مگر نتیجہ صفر! ابھی آگے یہ بھی سُن ..... کہیں بھی یہ نہیں فرمایا گیا کہ تیری ماں کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ اس کا باکردار اور پارسا ہونا مشروط ہے۔ اگر وہ سینہ ڈھانپتی ہو! اگر حجاب لیتی ہو! نہیں..... بلکہ اگر وہ زندہ نہ ہو تو اس کی بہن کی خدمت کر۔ اور اس کی بہن کے لیے بھی کوئی شرط نہیں رکھی گئی۔ اور یہی عورت اس مقام تک پہنچنے کے سفر کے دوران بہن بھی ہے اور بیٹی بھی ہے۔

(بشکریہ ویب سائٹ "ہم سب")

☆.....☆.....☆

محشرِ خیال

قانتہ رابعہ۔گوجرہ

کچھ تحریریں بہت جاندار اور بہت شاندار ہیں۔فرحت طاہر کا سفر نامہ واقعی بہت خاصے کی چیز ہے۔خبر دار ہوشیار! بتول کی لکھاری آئندہ اگر بذریعہ ٹرین سفر کریں تو ہر ریلوے اسٹیشن کا نام اور پہنچنے کے اوقات ضرور از بر کر لیا کریں۔گو کہ ان ملاقاتوں میں بس جھلک دیکھی جا سکتی ہے، ہاتھ ملائے اور ہلائے (الوداعی) جا سکتے ہیں، چیزوں کا تبادلہ کیا جا سکتا ہے، مگر یہ چند لمحوں کی ملاقات ذہن کو کتنا فریش کر دیتی ہے، کتنا حسین سرمایہ بن جاتی ہے، کوئی کیا جانے! فرحت نے روانگی سے قبل بتا تو دیا تھا مگر افسوس گوجرہ ان کے سفر کے راستے میں نہ تھا وگرنہ دیدہ دل کے علاوہ سب کچھ ہی فرش راہ کئے ہوتے بالخصوص جب ریل رینگنا شروع ہوتی ہے تو دل کو سنبھالنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔اسی حوالے سے ایک دو اشعار بھی یاد آ گئے، پیش خدمت ہیں۔

اک تیز تیر تھا کہ لگا اور نکل گیا
ماری جو چیخ ریل نے جنگل دہل گیا
صبح کاذب کی ہوا میں درد تھا کتنا منیرؔ
ریل کی سیٹی بجی لو دل لہو سے بھر گیا

رسالے میں نوشین اصغر کی تحریر ''ڈاکٹر بیوی ڈاکٹر بہو''، بہت پسند آئی۔لکھاری کا تعارف اگر دے دیا جاتا تو لطف دوبالا ہو جاتا۔یہ عفت قریشی کی صاحبزادی ہی ہیں ناں؟ نام نہ بھی ہوتا تو تحریر کا انداز بتا دیتا ہے کہ کس خاندان سے تعلق ہے۔بس یہی کہا جا سکتا ہے۔ ؎ ایں خانہ ہمہ آفتاب است، ڈاکٹر سعدیٰ کی طرح ان کو بھی قابو کر لیں، فطری سلاست اچھی تحریر کے تمام لوازمات موجود ہیں۔آپ اسے بیک وقت آپ بیتی، جگ بیتی، انشائیہ، نہاں خانہ دل، ہر کالم کے فریم میں فٹ کر سکتے ہیں۔ویل ڈن نوشین، ونس مور!

فرحی نعیم، عافیہ رحمت، حاجرہ ریحان کے افسانے بھی ٹھیک تھے۔ڈھائی منٹ کے اختتامیے کو میری ناقص عقل فوری طور پر نہ سمجھ سکی۔ظاہر ہے قصور میرا ہی ہوا۔

اداریئے میں محمد علی کی وفات پر شذرہ ڈھونڈتی رہی۔افشاں نوید نے ''تمہاری وفا ہمارا اثاثہ'' لکھ کر حق ادا کر دیا۔باقی جو تحریریں تبصرہ سے رہ گئی ہیں وہ پڑھنا باقی ہیں۔

☆.....☆.....☆

حبیب الرحمن۔کراچی

حاجرہ ریحان صاحبہ، کا افسانہ ''ڈھائی منٹ'' ہے تو بہت خوب لیکن شروع کی سطور میں ''پان سے بھرا ہوا منھ'' ''ہمارے کنے'' اور ''اب میں تنے'' اس بات کی وضاحت کے لئے کافی ہیں کہ اشارہ کن کی طرف ہے۔ان سے معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ بغیر کسی قوم کی شناخت ظاہر کئے بھی یہ مضمون مکمل اور بھرپور ہی تھا۔پھر تیزاب گردی اور خواتین کو غیرت کے نام پر جلا دینے کا تصور۔۔۔۔۔۔۔ یہ ساری جھوٹی غیرت وحمیت پاکستان میں کہاں کہاں پائی جاتی ہے ہم سب جانتے ہیں۔یہ کسی خاص طبقے سے مشروط نہیں۔

''عافیہ رحمت'' صاحبہ کی تحریر ''میں ترے جمال کا عکس تھا'' مختصر مگر پر اثر ہے۔یہ سچ ہے کہ ہر فرد اگر اپنے رویوں پر خود غور وفکر کرے تو بہت سی مشکلات اور مسائل یوں حل ہو سکتے ہیں جیسے وہ تھے ہی نہیں۔

''آسیہ عمران'' صاحبہ کا مضمون ''فطرت کو مسخ ہونے سے بچائیں'' اچھا لگا۔بچے ہوں یا بڑے، ان کو مصروف رکھنا ضروری

ہے۔ جب یہ سب کچھ نہیں تھا تو ''کنچے، لٹو، تاش، لڈو'' اور اسی طرح کے نہ جانے کتنے فضول قسم کے گیم ہوا کرتے تھے۔ اس لئے ضروری ہے کہ گھر کے بڑے انھیں وقت بھی دیں اور ان کے لئے تعمیری مصروفیات ڈھونڈ کے رکھیں۔

''نوشین اصغر'' کا ''ڈاکٹر بیوی ڈاکٹر بہو'' بھی بہت خوب ہے۔ بہرحال معاشرے میں خواتین ڈاکٹرز کی اشد ضرورت ہے۔ البتہ زیادہ سے زیادہ دولت کا حصول ذمہ داریوں سے دوری کا باعث بن جاتا ہے۔ اگر خواہشات کو محدود کرلیا جائے تو گھر اور ہسپتال دونوں بہت خوبی کے ساتھ سنبھالے جاسکتے ہیں۔

اداریہ حالات حاضرہ پر آپ کی بھرپور نظر کا عکاس ہے۔ ''چھوٹو'' پکڑا جائے اور وہ بھی ملٹری آپریشن کے بعد۔۔لیکن۔۔ ''موٹو وں'' کا پکڑا جانا تو درکنار، ان کا نام تک نہ آنا، ڈاکٹر عاصم کی گرفتاری اور اس کے آشکارا کیے گئے ''مگرمچھوں'' پر ہاتھ نہ ڈالنا، اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا اعلان جنگ کرنے والوں سے چشم پوشی..... یہ سب ایسے سوالیہ نشان ہیں جن کا جواب شاید اب تاریخ ہی دے تو دے۔

رہی ٹی وی چینلوں کی رمضان ٹرانسمیشن والی بات تو اس بار حد ہی ہوگئی، بڑے بڑے ''زہاد'' موم کی طرح پگھلتے نظر آئے، متقیوں نے جنت زمین پر ہی مع حور وغلمان سجائی (استغفراللہ)۔

زاہد حدودِ عشق خدا سے نکل گئے
انسان کا جمال جو دیکھا پھسل گئے
ٹھنڈے تھے لاکھ حسن کی گرمی سے جل گئے
کرنیں پڑیں تو برف کے تودے پگھل گئے
القصہ دین کفر کا دیوانہ ہوگیا
کعبہ ذرا سی دیر میں بت خانہ ہوگیا

اچھے اشعار ہوں اور دلوں کو متاثر نہ کرسکیں ممکن ہی نہیں۔ ذیل میں شعرا کے اچھوتے مضامین لئے منتخب اشعار ملاحظہ کیجئے اور داد دیجئے۔

نجمہ یاسمین یوسف

سب سے چھپ کے جسے جلانا پڑے
ایسے خط کا جواب مت لکھنا

آمنہ رومیصا زاہدی

سمجھ رہے تھے کہ بخشش نہ مل سکے گی مجھے
وہ جانتے ہی نہیں کس کی بارگاہ میں ہوں

کرامت بخاری

جنھیں لمحے نہیں صدیاں سنیں گی
میں ان گیتوں میں بھی گایا گیا ہوں

اللہ سب لکھاریوں کے شوق کو اور مطالعہ کرنے والوں کے ذوق کو اور فزوں تر کرے (آمین)

☆.....☆.....☆

فرحت طاہر۔ کراچی

جولائی کا بتول ہاتھوں میں آیا تو ٹائٹل پر ہی اپنا سفرنامہ نظر آ گیا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ مکمل شائع ہوا ہے۔ بعدازاں دیگر تخلیقات دیکھنی شروع کیں تو سیر و سیاحت کے عنوان سے سفر امریکہ پر مبنی ایک اور روداد نظر آئی۔ خیال آیا کہ قارئین بیچارے کس قدر الجھن محسوس کریں گے۔ جیسے کھانے کی میز پر دو سویٹ ڈش موجود ہوں اور مہمان سوچ میں پڑ جائے کہ کون سی کھاؤں۔۔۔ من پسند یا جو خوش ذائقہ نظر آئے! بہتر ہوتا کہ ہمارا مضمون اگلے شمارے تک مؤخر کر دیا جاتا، ہمیں کون سا برا ماننا تھا۔۔۔ آخر پہلے دو مضامین مسترد بھی تو ہو چکے ہیں۔ جی ہاں! بتول کی ادارت نے ہماری تخلیقات پر نظر ثانی کی درخواست کی۔ مطلب یہ کہ قابل اشاعت نہیں۔۔۔۔۔ امید ہے ان تمام لکھاریوں کی اشک شوئی ہوئی ہوگی جو اپنی تحریر کو لاپتہ پاتے ہیں۔ کہنے کی بات یہ کہ اشاعت میں مروت کے بجائے مواد اور اس کے معیار کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔

باقی سب مضامین اچھے لگے۔ خصوصاً حمیرا خالد نے جس طرح

تجدید واحیائے دین کا خلاصہ پیش کیا طبیعت خوش ہوگئی۔امید ہے مولانا کی باقی کتب پر بھی آپ کی نظر ہوگی۔افشاں نوید اور فرحی نعیم خوب ہیں ماشاء اللہ۔۔۔ ذرا جو آرام کر لیں ! اللہ ہمت قائم رکھے!نصرت یوسف، قانتہ رابعہ کی کمی لگی اور شمیم فاطمہ تو لگتا ہے لمبی چھٹیوں پر ہیں۔ آسیہ راشد کی بھی غیر حاضری لگی، کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ اس نام کی ہیٹ ٹرک سے بچنا تھا۔۔۔۔آسیہ شبیر اور آسیہ عمران ۔۔۔۔ عافیہ رحمت ماشاءاللہ فارم میں آ گئی ہیں۔امید اور دعا ہے رفتار برقرار رہے۔فریدہ خالد قارئین کے لیے نئی سے نئی تحقیق سامنے لاتی ہیں۔ہاجرہ عمران نیا نام تھا۔اس کہانی کے انجام میں تشنگی محسوس ہوئی۔نوشین اصغر نے بہت اچھا موضوع چھیڑا ہے۔

بتول کی ساٹھ سالہ تقریبات کی کیا خبر ہے؟ بتول کے سائز پر بہت بات ہو رہی ہے۔انفرادیت کی اپنی الگ شان ہے۔ترسیل اور معیار کو اپ رکھا جائے تو گیٹ اپ ثانوی ہو جاتا ہے۔ویسے ریفرنڈم کروالیں اس بات پر!

☆.....☆.....☆.....

صبیحہ نبوت۔لاہور

آسیہ راشد بڑی مشفق خاتون ہیں اسی لئے کچھ نہ بھی لکھنے کو دل چاہے تو ان کا پر خلوص انداز لکھنے پر مجبور کر دیتا ہے اور قلم چل پڑتا ہے۔ جون کے پرچے پر بات کرتے ہوئے ہم رب کریم کے نام سے شروع کرتے ہیں پھر جو کام اس کے نام سے ہو اس پر بحث کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ویسے بھی صائمہ کا انداز اختصار اور معلومات کے لحاظ سے بتول کا نچوڑ ہوتا ہے۔

قانتہ رابعہ کا موضوع حسب معمول اصلاحی ہے اور اچھا ہے۔ربیعہ ندرت بھی خوب لکھتی ہیں حسب معمول مضمون لمبا تو ہے لیکن دلچسپ ہے لیکن ایک بات سے اختلاف ہے کہ جب بچے آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کی دھڑکن ہیں تو پھر گھر جانے میں جلدی کیوں ہے؟

آسیہ عمران کا ''آخری کانٹا'' کافی دردناک ہے اور زمانہ حال کے مطابق بھی۔یہ صحیح ہے کہ بہت سے لوگ ماں بہنوں کی وجہ سے اپنے گھر اجاڑ لیتے ہیں۔اس میں اللہ تعالیٰ سے دوری اور کچھ جہالت بھی شامل ہوتی ہے۔''شب زندگی'' سبق آموز کہانی ہے۔دادی سے محبت کے اظہار کی اچھی تصویر کشی ہے یہ مضمون 1961ء کا ہے، اس عرصے میں یہاں بھی بہت سے اولڈ ہومز بن چکے ہیں جہاں اولاد والدین کو چھوڑتی ہے۔

ڈاکٹر نعیم اقبال کے بارے میں جو سعدیٰ مقصود صاحبہ نے لکھا ہے بڑا حیران کن دلخراش اور سبق آموز بھی ہے۔ایسے لوگ اس دنیا میں شاذ و نادر ہی ہونگے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے گا۔کاش یہ دنیا ایسے ہی لوگوں سے آباد ہو جائے۔آمین کراچی میں ہونے والے ادبی فورم کا تذکرہ بہت خوبصورت انداز میں'' عالیہ شمیم نے پیش کیا ہے۔یہ شعر بہت خوبصورت ہے۔

ایک شجر ایسا محبت کا لگایا جائے
جس کا ہمسائے کے آنگن میں بھی سایا جائے

وہ درخت اب ناپید ہے کاش اس کی جڑیں ہمارے ہر گھر میں ہوتیں ایسی محفلیں لاہور میں بھی ہونی چاہئیں تا کہ ہمیں بھی ایسے لوگوں کی قربت حاصل ہو سکے۔

ٹوٹا رشتہ بڑی مختصر اور جامع تحریر ہے۔صائمہ راحت نے جو کچھ اپنے بارے میں لکھا ہے لگتا ہے وہی میری بھی کہانی ہے۔

مئی کے مہینے میں بھی قابل قدر تحریریں ہیں۔''عروسی جوڑے'' کے بارے میں میرا خیال ہے کہ یہ جوڑا اپنی حیثیت کے مطابق بنوانا چاہیے دوسروں کی نقل کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے کہ پھر اس کو بیچا جائے۔یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی موقع پر اپنی ہی بیٹی یا بہو کو دے دیا جائے یوں اس کو دلہن در دلہن چلنا چاہیے۔ویسے بھی پرانے زمانے کی خواتین سے میں نے سنا تھا کہ عروسی جوڑا سہاگ کی نشانی ہوتا ہے اس کی ہر لحاظ سے قدر کرنی چاہیے اور حفاظت بھی۔

''شجر پہ بور'' نصرت یوسف سے معذرت کے ساتھ، انہیں انگریزی استعمال پر اعتراض ہے جبکہ اپنی تحریر میں انہوں نے خود کئی الفاظ انگریزی کے استعمال کئے ہیں جیسے ''فریش ہونے کے بعد''

ڈسٹ بِن وغیرہ۔ بچے بھی ماما کہتے ہیں پھر انگریزی کے استعمال سے شکوہ کیوں؟

فرحی نعیم کا ''فاتح'' بہت سبق آموز افسانہ ہے جس میں عورت کی مظلومیت اور مرد کی حاکمیت کو دکھایا ہے یہ حقیقت ہے کہ عورت بچوں کی خاطر یا اپنی عزت کے لئے ہر طرح کا ظلم سہہ لیتی ہے ویسے بھی اس میں مرد سے زیادہ صبر اور برداشت ہوتا ہے لیکن یہ کم ہی ہوتا ہے کہ مرد اپنے آپ کو بدل لے بڑی بات ہے۔

''بیگموں کی باتیں'' دلچسپ تحریر ہے اور زمانہ حال کے مطابق ہے۔ آجکل درس وتدریس کا زیادہ ہی رواج ہے جو نیک کام تو ہے لیکن نوکر پر اس کا تاثر غلط انداز میں ڈلا ہے جس کی وجہ سے ملازم نے کچھ سیکھنے کے بجائے الٹا تاثر لیا۔

فرحین اقبال نے بچے کو بگاڑنے کے بعد اس کی اصلاح بھی کردی اور صحیح راستہ تلاش کر دیا۔ اچھا اور سبق آموز افسانہ ہے بشریٰ راشد خان کا ''خالی دامن'' ان لوگوں کے لئے عبرت کا مقام ہے جو بچوں پر توجہ نہیں دیتے۔

''ابھی امید باقی ہے'' اچھی علامتی کہانی ہے۔ ناممکن کچھ بھی نہیں ہے محبت فاتح عالم کو ہر جگہ آزما سکتے ہیں۔ آسیہ راشد ہمیں نئے نئے لوگوں سے ملوا دیتی ہیں جس کے لئے ہم ان کے مشکور ہیں پھر رمانہ عمر کا ہلکا پھلکا بہت اچھا موضوع ہے بہت اچھا انداز بہت اچھے لوگوں کا تذکرہ ماضی اور حال کو بڑے سلیقے سے لڑی در لڑی پرویا ہے اردو کو بیچاری ہی کہا جاتا ہے تو بابائے اردو اسے کیوں قبول کریں گے۔

عائلہ ہاشمی کا مضمون بہت سبق آموز ہے اور نیکی کی طرف راغب کرتا ہے۔ ''آگ ہے اولاد ابراہیم'' معلوماتی تحریر ہے شعور اور آگاہی کا نیا در کھلتا ہے جس کے لئے ہم فرحانہ احمد کے ممنون ہیں۔

☆.....☆.....☆

سیدہ فاطمہ گیلانی۔ ساہیوال

ماہ رمضان کی تشریف آوری سے دو دن قبل میرے جیسے سینکڑوں ہزاروں اپنے قارئین اور مداحوں کے استفادہ کے لئے بتول آ گیا۔ الحمدللہ جیسے تپتے صحرا میں شبنم، پیاسے کو پانی اور بھوکے کو لذیذ کھانا مل جائے۔ اچھا مطالعہ چاہنے والوں کے لئے اس دور میں شاید ہی کوئی دوسرا شمارہ اس کا ثانی ہو۔ اچھی خوشگوار شکر گزاری والی زندگی گزارنے کے لئے ایسا مطالعہ ناگزیر ہے۔ لکھنے والے ماشاء اللہ ایک سے بڑھ کر ایک ہیں آمنہ رمیصا زاہدی ''وہ دن بھی کچھ دور نہیں'' کمال کر دیا۔ دکھی دلوں کا سارا درد اور انجام اپنے شاندار اشعار میں سمو دیا۔ قانتہ رابعہ ''دامن کو ذرا دیکھ'' ان مبارک گھروں کے عین مطابق ہے جن میں منادی کرنے والا ندا لگاتا ہے اے بھلائی کے طالب آگے بڑھ اے برائی کے چاہنے والے رک جا۔ ربیعہ ندرت کا سفرنامہ ''مجھے گھر جانا ہے'' سفر آخرت کی بڑی یاد دلاتا ہے۔ باخبر رہنا میں ناصرہ بہن نے موضوع کے عین مطابق سارے کردار تخلیق کئے ہیں۔ سعدیٰ مقصود نے بھائی ڈاکٹر نعیم اقبال کی زندگی اور موت کے تذکرے سے رلا دیا۔ ایسے لوگوں کی جدائی پر تو زمین وآسمان کی ہر چیز روتی ہے۔

''باتوں سے خوشبو آئے'' اہتمام حریم ادب کی طرف سے ہو اور اہل علم بلائے گئے ہوں تو ایسی محفل کی روداد بھی تو شاندار اور جاندار ہی ہوگی۔ بہن عالیہ شمیم بھی لکھتی ہیں کہ ادیب کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ معاشرے کی خرابیوں کا ادراک کرتے ہوئے اس کے حل کی طرف رہنمائی کرے، ہم ایسے بامقصد ادب، صحافت کی تخلیق کریں جو آج کے دور میں انسانی المیوں کا عکاس ہو اور انسانیت کی راہ نجات کی طرف رہنمائی کرے۔

صائمہ راحت نے ٹوٹا رشتہ کے عنوان سے کئی لوگوں کی صورتحال پر روشنی ڈالی ہے اللہ کرے ہم سب لوگ اپنے صحیح مقصد کی طرف لوٹ آئیں، رکاوٹ مخالفت تو ہوگی مگر یہی وہ لمحات ہوتے ہیں جب انسان کو ثابت قدمی اور استقلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے فراخ حوصلگی سے لوگوں کی حوصلہ شکن باتوں کو برداشت کرنا چاہیے اور میدان عمل میں کود پڑنا چاہیے۔ ہمت مرداں مدد خدا، ایک دفعہ کام کا آغاز ہو جائے تو خود بخود اطراف کا ماحول سازگار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ رمانہ عمر نے بچوں کے

ساتھ رمضان المبارک اور عید الفطر کے بڑے پیارے پیارے مشورے لکھے ہیں اپنے تجربات کا نچوڑ ، اپنے مطالعے کا حاصل اپنی بہنوں کوفراہم کئے۔

شب زندگی بتول فائل سے بہن ثریا اسما کی تحریر خاصے کی چیز ہے ۔لیکن ہمارے ہاں بھی سوائے چند سلجھے گھرانوں کے صورت حال گھمبیر ہورہی ہے ہر ماں کہیں اور جا کر رہنا چاہتی ہے تا کہ اپنی اولاد کا جو اسے بوجھ سمجھ رہی ہے، بوجھ اتاروں ،فرق صرف یہ ہے کہ وہ لوگ مسئلے کا الٹا سیدھا حل نکال لیتے ہیں اور ہم مسئلے کو مسئلہ سمجھتے ہی نہیں ،سب اچھا ہے کی گردان کوفخر اور خوبی سمجھتے ہیں مجھے یہ بات بہت کھلتی ہے کہ ہم اپنی کمی کوتاہیوں پر نظر نہیں دوڑاتے غیروں کے عیب ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ ہماری مائیں جوانی میں خلوت مانگتی تھیں، بڑھاپے میں جلوت مانگتی ہیں جو ایک فطری امر ہے ۔ وہی آپ کے والی بات کہ ہم ہنسی خوشی سے اولاد کی پرورش اور تربیت کریں گے تو اولاد بھی اتنی ہی خوشی سے والدین کی خدمت اور تواضع کرے گی۔ اگر چہ اولاد کو ہر صورت میں والدین کی خدمت اوران سے حسن سلوک کرنا چاہیے،جس طرح وہ چاہیں ویسا ہی، اپنی مرضی کا پابندی والا حسن سلوک بھی والدین کو دکھی کرتا ہے لہٰذا اس سے بھی اجتناب کرنا چاہیے بچوں کی طرح ان کی دلجوئی اور خوشنودی ہمارا فرض اولین ہے۔

☆.....☆.....☆

سحر شہزاد۔ملتان

اپریل کے شمارے میں حمیرا خالد کا ’’سسرال کو ناک آؤٹ کیجئے‘‘ پڑھ کر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ان کے مفید مشورے امید ہے بہوؤں کے بہترین کام آئیں گے ۔صبیحہ نبوت کی انڈیانا کی سیر دلچسپ لگی۔ اتنے اچھے اور تفصیلی انداز میں سیر کرائی کہ دل چاہا ہم بھی اڑ کر پہنچ جائیں۔

ماہنامہ بتول میں بچوں کی پرورش اور تربیت کے لئے ایک سلسلہ شروع ہوا تھا جو غالباً نوزائیدہ بچے کی دیکھ بھال کے نام سے تھا۔ میں مدیرہ صاحبہ سے درخواست کرونگی کہ اس سلسلہ کو دوبارہ سے شروع کیا جائے بلکہ نوزائیدہ بچے سے لے کر ہر عمر کے بچوں کو کیسے ڈیل کیا جائے اس سلسلے میں میری یہ رائے ہے کہ ہر بہن اپنے اپنے تجربات بتائے کہ مثلاً میرا بچہ بہت ضدی تھا میں نے اُس کی یہ عادت کیسے ختم کی کیونکہ دو تین سال کے بچے کہنا نہیں مانتے پہلے لوگوں نے بھی تو بچے پالے ہیں۔آخر کہاں کمی ہے تربیت میں ؟ آجکل کی ماؤں کو طریقہ سکھایا جائے تا کہ ہمارے بچے بھی ہمارے لئے بہترین صدقہ جاریہ بن سکیں۔

☆.....☆.....☆

اپنی عدالت میں

دنیا میں باہمی تعلقات کو پائیداری کے ایک ہی نکتہ پہ قائم رکھنا مشکل امر ہے، بلکہ ناممکن ہے۔ رشتوں ناتوں کا کوئی بھی میدان ہو، تعلقات میں اونچ نیچ گرم، سرد ہوتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بھی ہرگز یہ مطلوب نہیں اس لئے کہ وہ خالق جانتا ہے کہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ اور اللہ رب العزت کا یہ فیصلہ بھی ہرگز نہیں ہے کہ وہ اپنے بندے کو سو فیصد پاک وصاف رہنے کی صورت میں ہی قبول کرے گا۔ بندے پہ کوشش کرنے کی شرط لگائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو وہ بندے بھی عزیز ہیں جن سے غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں کیونکہ کمزور لمحات انسان پہ غالب آ سکتے ہیں۔ باہم دلوں میں میل بھی آ سکتا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ناراض بھی ہو سکتے ہیں۔ کبھی حسد اور کبھی رشک میں مبتلا بھی ہو جاتے ہیں۔ غصہ اور انتقام کے جذبات ان کو بھی ستاتے ہیں طمع اور لالچ کا خیال ان کے دل میں بھی آ سکتا ہے۔ ''انا'' ہر انسان کو پیاری ہوتی ہے اور کبھی یہ انسان کے نفس پر غالب آ سکتی ہے۔ یہ سب بشری کمزوریاں ہیں، کوئی انسان ان سے مبرا نہیں ہو سکتا ان کمزوریوں پہ قابو پانے کی مسلسل کوشش ہی دراصل انسان کا میدانِ عمل ہے۔

جو ان کمزوریوں پہ جس قدر قابو پایا جاتا ہے وہ ہی تقویٰ کا معیار ہے۔ صالح انسان وہی نہیں جو ان فطری انسانی کمزوریوں سے مغلوب نہیں ہوتے۔ ان پر قابو پانے میں پوری سعی و جہد کرتے ہیں، ان کا مداوا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے معافی کے طلبگار رہتے ہیں۔ غلطی اور معافی مانگنے کے درمیان جتنا عرصہ کم ہوگا انسان اپنے آپ کو اتنا ہی جلدی مطمئن اور مسرور بنا لے گا۔ غلطی کرنا اہم نہیں ہے۔ غلطی کی معافی مانگنا اہم ہے اور جلدی معافی مانگنا بہت زیادہ اہم ہے۔ اور یہی عمل اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، اچھے خطا کار اپنی خطا اور گناہ پر جلدی متنبہ ہو جاتے ہیں اور خطا کو تسلیم کر کے اصلاح کی طرف قدم اٹھاتے ہیں۔ اپنی غلطیوں کو دہراتے نہیں، ضد اور ہٹ دھرمی سے ان پر جمے نہیں رہتے اور اپنی غلطیوں کو دوسروں کے سر پہ تھوپنے کے کیلئے بہانے تلاش نہیں کرتے ۔

معاشرے میں وہ انسان دوسروں کی نظروں میں کھویا ہوا مقام جلدی حاصل کر لیتا ہے جو غلطی تسلیم کرنے اور اصلاح کرنے میں پہل کرتا ہے۔ غلطی مان لینا انسانیت ہے غلطی کو نہ ماننا، اس پر اصرار کرنا شیطانی رویہ ہے۔ مغرور اور متکبر انسان خود کو غلطی سے مبرا سمجھتا ہے، خود کو کامل جانتا ہے اور کسی سے بھی معافی مانگنا یا غلطی تسلیم کرنا اپنی ذلت سمجھتا ہے۔ اگرچہ وہ خود رشتے عمر مرتبے میں کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ جو انسانوں خصوصاً بزرگوں کے سامنے اپنی ''انا'' کا بت رکھ کر اس کی پوجا کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی اپنی پیشانی کو جھکانے میں سستی اور کوتاہی کرتا ہے۔ غلطی تسلیم کر کے، معافی طلب کرنے کے بعد، اصلاح کر کے جو روحانی تسکین ملتی ہے وہ اس انتقامی رویہ، ضد اور ہٹ دھرمی سے نہیں مل سکتی۔ غلطی نہ مان کر ضمیر کو بے چین رکھنے سے جو ذہنی آزار ملتا ہے وہ بہت سی نفسیاتی عوارض کا باعث بن جاتا ہے۔ ضدی اور گستاخ لوگ شرفِ انسانی کی نفی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس ''احسن تقویم'' پہ بنایا ہے اس کا ظاہر و باطن پر تقاضا کرتا ہے کہ وہ صفات اللہ کا پرتو بنے۔ اگر اس نے اس راستہ کو نہ اپنایا تو پھر وہ ''اسفل سافلین'' کے مقام پر پہنچ جائے گا جو شرفِ انسانی کے شایانِ شان ہرگز نہیں ہے۔

جب غلطی تسلیم کرنے اور اصلاح کرنے والا دوسروں کی نظروں میں کھویا مقام حاصل کر لیتا ہے تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی مزید راہنمائی کی جاتی ہے اور فرشتے اس کو ثابت قدمی کی دعا دیتے

ہیں۔اور انسان کی زندگی میں یہ لمحات کم ہی آتے ہیں کہ انسان خود اپنی عدالت میں اپنے نفس کو پیش کرے۔اپنی غلطیوں کے مختلف پہلوؤں کو تسلیم کرے یا صفائی پیش کرے خود ہی منصف ہو اور خود کو مجرم ثابت ہو جانے پہ سزا بھی تجویز کرے۔اور جب اپنی صفائی ایمانداری کے ساتھ پیش کرے تو اپنے آپ کو اس آزار سے آزاد کرلے جو اس کو بے چین کئے ہوئے ہے۔یہ ''عدالت'' قائم کرنے کی مشق ہو جائے تو انسان ''**لا خوف علیھم ولا ہم یحزنون**'' کا لطف اٹھا سکتا ہے۔ احتساب ایک ایسا عمل ہے جس کے بعد ہر صورت میں انسان کو اطمینان قلب نصیب ہوتا ہے۔اطمینان قلب سراسر اپنے ذہن کو منفی سوچوں سے آزاد کرنا ہے۔جو لوگ ہر معاملے کے ہر پہلو کو منفی نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنے ذہن میں بنائے ہوئے منفی سانچے میں دوسروں کو فٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ خود بھی اذیت میں رہتے ہیں اور دوسروں کو زچ کرنے کے منصوبے سوچتے رہتے ہیں۔اپنی صلاحیتوں کا غلط رویوں سوچوں اعمال میں ضائع کرنا انسان کا سب سے بڑا نقصان ہے۔

ندامت دراصل وہ پہلا ردعمل ہے جو غلطی کرنے کے بعد انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔یہ ردعمل انسان کی عقل وشعور، علم کے لحاظ سے ہر انسان میں پیدا ہوتا ہے اور مومن ایمان باللہ اور عقیدہ آخرت کے پیمانے کے مطابق جلد یا بدیر ظاہر کرتا ہے۔تقویٰ کا معیار جس قدر زیادہ ہوگا، اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونے اور جواب دہی کا احساس جتنا شدید ہوگا، ندامت اتنی ہی جلدی انسان کو بے چین و بے قرار کرے گی۔ایک ندامت اللہ کی نافرمانی ہے اور دوسری بندوں کی حق تلفی و زیادتی کے ردعمل میں پیدا ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان بندوں کے بارے میں غلط رویہ رکھتا ہے۔ظلم وزیادتی وہ انسان کیسے کرسکتا ہے جو اپنے رب کے احکام کو یاد رکھتا ہو جس کو ایک بڑے دن کے شدید عذاب کا سامنا کرنے سے خوف آتا ہو۔کچھ سلیم الفطرت لوگ اپنے غلط افکار کو عملی جامعہ پہنانے سے پہلے ہی نادم ہو جاتے ہیں۔کچھ ارادے کی پختگی سے پہلے متنبہ ہو جاتے ہیں۔کچھ غلط کام کو کر لینے کے بعد پشیمان ہوتے ہیں اور کچھ نادان کم علم لوگ بڑے نتائج کے سارے پہلو دیکھنے کے بعد نادم ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی بھی مرحلے میں پشیمانی کا احساس نہیں رکھتے بلکہ اپنی غلطی پر اصرار کرتے ہیں، غلطی آشکار ہونے پہ شرمندہ ہونے کی بجائے اس پر ہٹ دھرمی سے قائم رہنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں۔یہ لوگ معاشرے کے ناسور ہوتے ہیں۔ان کی وجہ سے ماحول پراگندہ ہوتا ہے، معاشرے میں ابتری پھیلتی ہے۔اور دوسرے لوگوں کے قلب وذہن اور اعصاب پہ برا اثر پڑتا ہے، کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔یہ شیطانی سوچ رکھنے والے لوگ چاہتے ہیں کہ دوسروں کو نظروں میں جو ان کا مقام گر گیا ہے اس کا بدلہ پورے معاشرے سے لیں۔سب کو مطعون کرتے ہیں، برا بھلا کہتے ہیں، دوسروں کے عیب تلاش کرتے ہیں دوسروں کی خیر خواہی، ہمدردی کو اپنے لیے ''طنز'' سمجھتے ہیں۔ہر کسی کی بات کو اپنے خلاف سمجھ کر محاذ آرائی شروع کر دیتے ہیں۔جب یہ منفی سوچ کے حامل لوگ کسی سے برا سلوک کرتے ہیں تو جواباً ''اچھائی'' کرنے والا ان کی نظروں میں مزید برا ہو جاتا ہے۔ان کا خیال ہوتا ہے کہ اس طرح ''اچھائی'' کا ردعمل ان کو مزید کمتر کر رہا ہے اور کینہ وبغض بڑھتا جاتا ہے۔ایسے لوگ دوسروں پہ ذہنی تشدد کر کے اپنے نفس کی تسکین چاہتے ہیں ایسے فرد کو برے رویے کا جواب جس قدر اچھے رویہ سے دیا جائے وہ ذہنی اذیت دینے کا پیمانہ بڑھاتا جائے گا جب تک کہ آپ اس کے گرے ہوئے معیار پر نہ آجائیں۔

ظلم وزیادتی کا جواب انتقامی رویہ سے نہ دینا اور جواباً حسن سلوک کرنا میدان جنگ میں جہاد کرنے سے بھی زیادہ مشکل امر ہے۔ یہ ایسا صبر ہے جو ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔یہ صرف انتہائی صابر لوگوں کو ودیعت کردہ انعام ہے۔اور یہ صرف انتہائی خوش نصیب لوگوں کو عطا کیا جاتا ہے۔'' (حم سجدہ) بلا وجہ کی بغض وکدورت ایسا شیطانی رویہ ہے جس کا مقابلہ کرنا جان جوکھوں کا کام ہے اور جب معاشرے میں قریب قریب رہنے والے، روزانہ کی بنیاد پہ ملنے والے کام کرنے والے اس

محاذ پر کھڑے ہوں تو ذہنی، قلبی اور اعصاب کی چومکھی لڑائی ہوتی ہے۔ بغض وکدورت کی بنیاد دراصل ''حسن'' ہے اور ذہنی امراض کی بنیاد ہے۔ اس کی نشانیاں یہ ہوتی ہیں چڑ چڑا پن ذہنی انتشار، خود پسندی ،دوسروں کو اپنے سے بہتر نہ دیکھ سکنا اور اس لئے دوسروں کی برائیاں تلاش کرنا، لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے نازیبا حرکات کرنا۔ کسی کی اچھائی، خوبی اور حسن سلوک کو بھول جانا، اس کو چھپانا اور عیب یاد رکھنا اور دوسروں میں تشہیر کرنا۔ مسلسل اس رویے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کی عادت بن جاتی ہے اور وہ ہر کام، ہر رشتہ میں عیب دیکھنے اس کو ثابت کرنے میں اپنی صلاحیتیں کھپانے لگ جاتے ہیں۔ خود کو درست ثابت کرنے کے لئے انہیں مسلسل تکرار کے ساتھ اپنا مدعا ہر کسی کے سامنے بیان کرنا پڑتا ہے۔ لوگ اس طرح کی تکرار سے بے زار ہو جاتے ہیں۔ تو آہستہ آہستہ ایسی عادت میں مبتلا افراد سوسائٹی سے کترانے لگتے ہیں۔ یوں دوسروں کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے والے لوگ خود تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں نتیجتاً لوگوں سے گلے شکوے شدت اختیار کر جاتے ہیں اور ذہنی ونفسیاتی عوارض بڑھتے جاتے ہیں۔ معاشرہ جن ابتر حالات کی طرف گامزن ہے ایسی نفسیاتی بیماریوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ روح کا اضطراب، ساری انسانیت کا مشترکہ دکھ ہے اور نفسیاتی و ذہنی خلفشار دراصل روح کو اس کے مقام پر نہ رکھنا ہے۔ اسی لیے انسان زندگی جیسی نعمت کو اپنے ہاتھوں ختم کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ روح ہی زندہ نہیں تو بدن ایک بوجھ ہے۔

مومن معاشرے میں بھی روح کا اضطراب اپنی آخری شکل پر پہنچتا جا رہا ہے۔ ہم اپنا جائزہ لیں روح کس درجے کی مضطرب ہے؟ اس کا اضطراب دور کرنا ہی مطمئن زندگی کی شرط ہے۔ اخلاقی بیماریاں ایمان کی کمی سے لاحق ہوتی ہیں۔ اور اگر حسد، کینہ وبغض، جھوٹ، الزام تراشی، غرور، تکبر جیسی بیماریاں لاحق ہیں اور اپنی کوتاہیوں کا محاسبہ کرنے اور خطاؤں کے لئے عدالت لگانا نہیں آتی تو روح کی آبیاری کرنے کی ضرورت ہے۔ مضطرب روح کو آب خورۂ ایمان لا کر دیجئے اور یہ آب خورہ ایمان دوسروں سے بھلائی کو قبول کرنا، یاد رکھنا، برائی کا جواب بھلائی سے دینا اور جو آپ کے بگڑے تیور کا جواب بھلائی سے دیتے ہیں ان کی قدر کرنا ہے۔ جن کو زبان یا حق تلفی سے دکھ دیئے ہیں ان سے معافی مانگنا بھی روح کی بے چینی دور کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس لیے کہ جب تک معافی نہ مانگی جائے روح میں خلش برقرار رہتی ہے۔ روح کی خلش کے ساتھ انسان ہمیشہ محبوب رہتا ہے۔ یہ لازمی امر ہے کہ ظالم اندر سے خائف رہتا ہے۔ اور خوف کے ساتھ زندگی گزارنے والے تخت وتاج کے مالک ہو کر بھی فقیر ہی رہتے ہیں۔ اس لیے کہ دنیا میں دل کا اطمینان لے کر جھونپڑی میں رہنا بادشاہت ہے۔ ''**نفس مطمنہ**'' حاصل ہو جانا دنیا و **مافیھا** سے بہت زیادہ بہتر ہے۔ اس عظیم الشان مقام کو پانے کے لئے آج اور ابھی قدم اٹھانا ہوگا۔ ندامت توبہ کی سیڑھی کا پہلا قدم ہے اور پھر اپنے ضمیر کی عدالت لگا کر اپنے خلاف خود مقدمہ دائر کرنا ہوگا۔

انسان اپنا منصف خود ہی ہے۔ وہ اپنے اعمال کے ہر رخ کو خوب جانتا ہے چاہے کتنی ہی معذرتیں پیش کرتا رہے۔ **بل الانسان علی نفسہ بصیرہ ولو القی معاذیرہ** (القیمۃ)

ہمیں آج ہی سے اپنا محاسبہ روزانہ کی بنیاد پہ کر لینا ہوگا تاکہ اس بڑے دن کی بڑی عدالت میں بادشاہِ حقیقی (رب کائنات) کے سامنے اپنی روح مطمئن ہو۔ جب پوچھا جائے گا، آج کس کی بادشاہت ہے؟ **لمن الملک الیوم**؟ (کسی کو اللہ اطمینان عطا فرمائیں گے اور کچھ خوف زدہ ہوں گے) ہر نفس اپنے اپنے حالات کے مطابق اقرار کرے گا **اللّٰہ الواحد القھار**۔

★...★...★